یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد

(سولہویں تا انیسویں صدی)

حکیم فخر عالم

2019

یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد

(سولہویں تا انیسویں صدی)

حکیم فخر عالم

اے، آر انٹرپرائزز، نئی دہلی

2019

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

کتاب کا نام	:	یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد
مصنف	:	حکیم فخر عالم
طبع اول	:	2019
تعداد	:	600
قیمت	:	500روپے
صفحات	:	259
طابع	:	اے، آر انٹرپرائزز، نئی دہلی
ناشر	:	حکیم فخر عالم
		سیکنڈ فلور، ثمرین اپارٹمنٹ، شاہ بشیر کالونی
		ہادی نگر، دوہرا معافی، علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۲
تقسیم کار	:	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

ISBN: 978-81-940846-1-7

مصنف سے رابطہ

Hakim Fakhre Alam

D-2nd Floor,Samreen Apartment

Shah Basheer Colony,Hadi Nagar

Dhaurra Mafi,Aligarh-202002

Mobile No.:9411653041

Email: fakhrealamx7598@gmail.com

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی
حکومت اتر پردیش، لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

انتساب

دادا محترم جناب محمد یونس شاہ صاحب
اور
نانا جان جناب محمد یٰسین شاہ صاحب
کے نام
(اللہ انہیں غریقِ رحمت فرمائے)
میری ساری حصولیابیاں انہیں بزرگوں کی دعاؤں کا ثمرہ ہیں۔

حکیم فخر عالم

فہرستِ عناوین

نمبر شمار	عناوین		صفحہ نمبر
1	اظہارِ خیال		11
2	حکیم فخر عالم اور طبی ادب	پروفیسر مولا بخش	18
3	محمد بن یوسف ہروی		31
4	یوسف بن محمد ہروی		34
5	حکیم الملک شمس الدین گیلانی		37
6	حکیم ابوالفتح گیلانی		39
7	حکیم شاہ فتح اللہ شیرازی		42
8	حکیم عین الملک شیرازی		45
9	حکیم علی گیلانی		48
10	حکیم مظفر بن محمد حسینی شفائی		51
11	حکیم فتح اللہ گیلانی		53
12	حکیم دوائی گیلانی		55
13	حکیم صدرا		57
14	حکیم امان اللہ خاں		59

15 حکیم معصوم خاں 63

16 حکیم نورالدین محمد عبداللہ 66

17 حکیم علوی خاں 69

18 حکیم شاہ اہل اللہ پھلتی 73

19 حکیم محمد اکبرارزانی 77

20 حکیم سید جلال الدین امروہوی 82

21 حکیم محمد حسین شیرازی 84

22 حکیم محمد شریف خاں 89

23 حکیم احسن اللہ خاں 93

24 حکیم ذکاء اللہ خاں 95

25 حکیم بقاء اللہ دہلوی 97

26 حکیم صادق علی خاں 99

27 حکیم سید غلام حسنین کنتوری 102

28 حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی 106

29 حکیم نور کریم دریابادی 110

30 حکیم محمد اعظم خاں 112

31 حکیم حسن رضا خاں 116

32 حکیم غلام محمود خاں 119

33 حکیم عبدالمجید خاں 123

34 حکیم عبدالعزیز 127

35 لکھنؤ مطب کا مطالعہ

132

36	حکیم محمد حسین رضا خاں	141
37	حکیم نجم الغنی رام پوری	144
38	حکیم محمد حسن حاذق میرٹھی	149
39	حکیم اجمل خاں	154
40	حکیم اجمل خاں اور یونانی نصابِ تعلیم	161
41	مدرسہ طبّیہ دہلی	172
42	ہندوستانی دواخانہ	182
43	مدرسہ طبّیہ زنانہ	187
44	برطانوی عہد میں طبّی نظامِ تعلیم	191
45	برطانوی عہد میں طبّی ترجمہ نگاری	196
46	آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کی حصولیابیاں	200
47	شمس الاطباء حکیم وڈاکٹر غلام جیلانی	205
48	شفاء الملک حکیم عبدالرشید	210
49	حکیم محمد الیاس خاں	213
50	شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان	219
51	شفاء الملک حکیم عبدالحمید	223
52	حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہر	229
53	حکیم محمد کبیر الدین	234
54	شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں	247
55	شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی	252

اظہارِ خیال (۱)

ہندوستان میں مسلم فاتحین کے داخلہ کے ساتھ یونانی طب کا ورود ہوا۔اس ملک میں یونانی طب کی آمد اور اس کے فروغ کی تاریخ پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ سوال اکثر اُٹھتا ہے کہ اس کی ضرورت یہاں کیوں محسوس کی گئی؟ جب کہ اسی جیسی ساخت کی ایک طب (آیوروید) پہلے سے موجود تھی، جس سے مسلم نو واردین اپنی معالجاتی ضرورتیں پوری کر سکتے تھے!۔

اس سوال کا ایک ممکنہ جواب یہ ہوسکتا ہے کہ علاج و معالجہ کے باب میں یہ نو واردین یونانی طریقۂ علاج کے عادی رہے ہوں گے، لہٰذا اپنی ضرورت کا سامان ساتھ لائے۔ مگر یہ جواب تعقل پسندی سے عاری ہے، اس لیے کہ جب انہوں نے ساری ضرورتوں کی تکمیل یہیں سے کی تو طریقۂ علاج کے باب میں ایسا کیوں نہیں؟۔

دراصل مسلم حکمرانوں کے ساتھ یونانی طب کی آمد کے محرک، معالجاتی تقاضوں سے زیادہ سیاسی داعیے تھے۔ جب کوئی قوم کسی ملک پر فتح حاصل کرتی ہے تو مفتوحہ علاقہ میں اپنے تہذیبی، لسانی اور مذہبی اُمور کو فروغ دینے کی کوشش کرتی ہے۔اسی فکر کے تحت مسلم فاتحین کے دورِ حکومت میں ہندوستان، مسلم تہذیب و ثقافت سے روشناس ہوا، یہاں عربی و فارسی نے رواج پایا اور اسلامی مذہب کی نشر و اشاعت ہوئی۔ مفتوحہ نوآبادیات میں اپنے تہذیبی آثار اور زبان و مذہب کو رواج دینا دراصل زمینی تسلط کے ساتھ ذہنی اور فکری سطح پر بھی غلبہ کے حصول کا ایک طریقہ ہے۔

ہندوستانی تاریخ کے سلطنت اور مغل ادوار کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اِس عرصے میں مسلم تہذیب و ثقافت اور زبان و مذہب کو یہاں پھلنے پھولنے کے خوب مواقع ملے۔ یونانی طب کا تعلق مسلمانوں کے علمی و تہذیبی اُمور سے تھا، لہٰذا دیگر تہذیبی متعلقات کی طرح مسلم حکمرانوں

نے ان کی نشر و اشاعت کی کوششیں بھی کیں۔ اُس زمانہ میں ایران اور سنٹرل ایشیاء کے مسلم ممالک یونانی طب کا مرکز اور گھوارہ تھے، ہندوستان کے نووارد حکمرانوں نے ان پڑوسی مسلم ریاستوں سے یونانی طب کو درآمد کر لیا۔ اس کے علاوہ علمی وفنی ضرورت کی دوسری بہت سی چیزیں بھی ان ممالک سے حاصل کیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنت اور مغل عہدِ حکومت میں یونانی طب کے ساتھ ایران اور سنٹرل ایشیاء کے تہذیبی اور علمی آثار کو ہندوستان میں فروغ کا موقع ملا۔ یہ سلسلہ مغلوں کی آمد سے پہلے شروع ہو گیا تھا، مگر مغلیہ عہد میں ان کے فروغ کی رفتار بہت تیز رہی۔

ایک نئی زمین پر وارد ہونے کے بعد اطباء کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہاں کے تقاضوں سے یونانی طب کو ہم آہنگ کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں اہلِ فن کے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اُن کا اَدویاتی سرمایہ موجودہ ضرورتوں کے لحاظ سے ناکافی تھا۔ اب تک جو دوائیں اُن کے معمول میں تھیں، ان میں بہت سی یہاں دستیاب ہی نہیں تھیں، لہٰذا ان کے متبادل کی تلاش ہوئی۔ فنی لحاظ سے ایک اہم تقاضا یہ بھی تھا کہ اس ملک کے باشندوں کی معالجاتی ضرورت کا سامان مقامی پیداوار سے ڈھونڈا جائے، اس لیے کہ یہاں کی دوائیں ان کے مزاج سے مطابقت رکھنے کے باعث زیادہ موثر تھیں۔ اس کا ایک آسان حل یہ تھا کہ آیوروید سے مدد لے لی جاتی، اس لیے کہ یہاں کی جڑی بوٹیاں پہلے سے ویدوں کے استعمال میں تھیں۔ ورنہ نئے سرے سے ادویہ کی تلاش و تحقیق جہاں وقت طلب تھی، وہیں اس کام کے لیے ایک طویل عرصہ بھی درکار تھا۔ یونانی حکماء نے بلا تذبذب ویدک ذخیرۂ عقاقیر سے استفادے کا فیصلہ کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ نہایت آسانی سے ایک بڑے مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیا۔ دوسرا فائدہ یہ سامنے آیا کہ اطباء انہیں دواؤں سے علاج و معالجہ کرنے لگے، جن سے یہاں کے باشندے پہلے سے مانوس تھے، لہٰذا ان لوگوں کو یونانی طب اپنانے میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی اور آسانی سے یونانی طب ہندوستانی باشندوں کے ذریعہ قبول کر لی گئی۔ چونکہ یونانی اور ویدک کے فنی اسالیب بہت حد تک یکساں ہیں، اس لیے یونانی طب کو آیوروید سے استفادے میں کسی مغایرت کا احساس نہیں ہوا۔

یونانی طب نے ہندوستان میں آمد کے ساتھ ہی آیوروید سے استفادہ شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس وقت جو کتابیں تالیف پائی ہیں، اکثر میں آیوروید سے اخذ و قبول کے نقوش ملتے ہیں۔ اس

عہد کی تالیفات مثلاً راحت الانسان مؤلفہ حکیم الیاس بن شہاب ملقب بہ ضیاء، مجموعۂ شمسی مؤلفہ خواجہ شمس الدین مستوفی، مجموعۂ ضیائی مؤلفہ ضیاء محمد مسعود رشید زنگی، طبِ شہابی اور طبِ شفاء الخانی مؤلفہ شہاب الدین عبدالکریم ناگوری وغیرہ میں ہندی طب کے اثرات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

ویدک مآخذ سے جزوی استفادہ کے علاوہ اس عہد میں ہندی طب کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی کیے گئے۔ مثلاً شفاء محمودی، مشہور ہندی طبیب واگ بھٹ کی کتاب 'اشٹنگ ہردے' کا فارسی ترجمہ ہے۔ اسی طرح سکندر شاہ لودھی کے حکم پر، بھوہ بن خواص خاں نے اہم ویدک مآخذ مثلاً چرک اور سشرت وغیرہ کی کتابوں سے کسبِ مواد کرکے 'معادن الشفا سکندر شاہی' تالیف کی تھی۔

مغلیہ عہد میں اَخذ و اِستفادہ کی یہ روایت نہ صرف مستحکم ہوئی، بلکہ اس کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع ہوا۔ اس دور میں جو تالیفی کام انجام پائے، ان کا معتد بہ حصہ علم الادویہ سے متعلق ہے۔ اس مضمون میں نئے اضافوں کی ضرورت بھی تھی اور اس زرخیز ملک میں اس کے مواقع بھی تھے، نیز ویدک استفادے نے اس کام میں بڑی سہولت پیدا کردی تھی، غالباً یہی وجہ رہی کہ ہندی عہد میں علم الادویہ سے متعلق بڑے اہم تالیفی کام انجام پائے۔

مغلیہ عہد کی تصنیفات میں ویدک مفردات کے علاوہ مرکبات اور ویدک دوا سازی سے بھی فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ یونانی قرابادینوں میں کشتوں کی شمولیت اور یونانی مطبوں میں کشتوں کے استعمال کا فروغ اسی عہد میں شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں حکیم شریف خاں اور ان کے خاندان کے طبیبوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

ایران سے ہندوستان کے طبّی روابط مغلیہ عہد سے پہلے ہی شروع ہو گئے تھے، جو مغلوں کے زمانہ میں اور مستحکم ہوئے۔ چونکہ عہدِ مغلیہ میں ایک نئی تہذیب تعمیر ہورہی تھی، اس لیے ایرانی طبیبوں کے لیے ہندوستان میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ بہتر مواقع تھے۔ ایرانی اطباء کے لیے اس ملک میں دلچسپی کی اہم وجہ، یہاں کے حکمرانوں کی فیاضانہ زرپاشیاں تھیں، اس کے علاوہ ایران کے ملکی خلفشار، حکمرانوں کے سیاسی جبر وتشدد اور حد سے بڑھی مذہبی تنگ نظری کے باعث وہاں صلاحیتوں کے آزادانہ پھلنے پھولنے کے مواقع کم ہو گئے تھے، اس لیے ایرانی فضلاء مامون جگہوں کی تلاش میں نقل مکانی پر مجبور تھے۔ مغلیہ عہد میں نہ صرف ایرانی طبیبوں کی بکثرت آمد رہی،

ہوگئی۔

ایران سے ہندوستان آنے والے طبیبوں کو یہاں کے حکمرانوں کے دامنِ فیض سے وابستہ ہونے کا موقع ملا۔ اس طرح یونانی طب، شاہانِ مغلیہ اور ان کے دربار سے بہت قریب رہی۔ اس قرب و تعلق کے باعث، طبیبوں کے تحفظِ مفاد کے ساتھ یونانی طب کا بھی بڑا فائدہ ہوا۔ بلکہ ان کی ہجرت سے ایران کی طبی مرکزیت ہندوستان منتقل ہوگئی۔

ہندوستان میں یونانی طب مغلوں کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھی تھی، جب ان کا دورِ انحطاط شروع ہوا تو یہ اثرات یونانی طب پر پڑنے لازمی تھے۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ حکومت سیاسی انتشار کا شکار ہوگئی، یہاں کے حالات کو غیر مامون سمجھ کر ایران اور وسطِ ایشیاء کے فضلاء نے آمد موقوف کردی۔ چونکہ مغلیہ عہد کی طبی تاریخ کا بڑا حصہ ایران اور وسط ایشیاء سے مستعار تھا، لہٰذا یہاں سے طبیبوں کی آمد رکنے کے بعد، یونانی طب کی رفتارِ ترقی میں بھی ٹھہراؤ آگیا۔

مغلیہ حکومت کا علامتی خاتمہ 1857ء میں ہوا، مگر اس سے بہت پہلے اس کے اثر و رسوخ کا دائرہ سکڑ گیا تھا اور سیاسی قوت کے لحاظ سے یہ بہت کمزور ہوگئی تھی۔ ان تمام واقعات کے براہ راست اثرات یونانی طب پر بھی پڑے۔

1857ء میں مغل حکومت کے علامتی اختتام اور برطانوی تسلط کے بعد جو دور شروع ہوا، اس میں یونانی طب کو بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ رہا کہ اس کی سائنسی حیثیت پر سوالیہ نشان قائم کرکے اسے ماضی کی ایک داستان قرار دے دیا گیا۔ ان حالات میں یونانی طب کو باقی رکھنے کے لیے اسے معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ برطانوی عہد کے تعلیمی نظام اور تصنیف و تالیف کے مطالعہ سے جو رجحان سامنے آتا ہے، اس میں اصلاح و تجدید کا پہلو بہت نمایاں ہے۔

اس زمانہ میں دانشور طبیبوں نے اصلاح و تجدید کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے جو فوری اقدام کیے، ان میں جدید طبی مضامین سے اَخذ و اِستفادہ کو ایک اہم اصلاحی عمل کے طور پر اپنایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی طب میں جدید سائنسی اثرات بہت واضح نظر آتے ہیں۔

1857ء کے بعد ایک نمایاں تبدیلی یونانی طب کے تعلیمی میدان میں دکھائی دیتی ہے اور نظامِ تعلیم کے حوالہ سے اس کی تنظیم کا رجحان سامنے آتا ہے۔ اس طرح برطانوی عہد میں طب کے

روایتی تعلیمی نظام کی جگہ ایک ایسا طریقۂ تعلیم متعارف ہوا، جو سابقہ روایتی انداز سے مختلف اور ہٹ کر تھا۔

تعلیم و تحقیق سے لے کر تصنیف و تالیف تک کے تمام شعبوں میں برطانوی عہد میں جو اصلاحی اقدام ہوئے ہیں، ان میں طبِ جدید سے استفادہ کا عنصر سب سے زیادہ ہے اور کہیں کہیں یہ اتنا غالب ہے کہ طبی فلسفہ کی روح ختم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ غالباً یہ اس لیے ہوا کہ طبِ جدید سے استفادہ کا فیصلہ اتنی عجلت میں کیا گیا کہ اِس کے حدود و قیود متعین ہونے سے رہ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلاح کے نام پر بہت سی چیزیں جدید طبی سائنس سے لے کر یونانی طب میں چسپاں کردی گئیں۔

برطانوی عہد میں یونانی طب کو جن نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا، اس میں جدید طب سے استفادہ ناگزیر تھا، لیکن اس کی حد بندی اور دائرے کا تعین ضروری تھا، جو شاید نہیں ہوسکا تھا۔

مغل اور برطانوی عہد کی زیرِ نظر تاریخ میں ایسے طبیبوں اور طبی کاموں کے اِحاطے کا التزام ہے، جن سے یونانی مطب و معالجہ کے علاوہ طبی تعلیم اور تصنیف و تالیف کے معاصر رویوں کا اظہار ہو اور تذکروں میں اجمال کے باوجود یہ کوشش رہی ہے کہ متعلقہ عہد کی مجموعی طبی پیش رفت اور اس کا اسلوب سامنے آجائے۔ مثلاً اس تذکرہ میں مغلیہ عہد کے صاحبِ تصنیف اطباء کو شامل کرنے کا اہتمام ہے اور برطانوی عہد کے ذیل میں تصنیف و تالیف کے علاوہ تعلیمی و تحریکی حصوں کے احاطہ پر توجہ مبذول کی گئی ہے۔

خانوادوں سے تعلق رکھنے والے طبیبوں کو اہمیت دینے کے ساتھ ایسے غیر روایتی طبیبوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، جن سے برطانوی عہد میں یونانی طب کو سہارا ملا۔

اطباء کے سوانحی حالات کے ذیل میں ایسے پہلوؤں پر توجہ کی گئی ہے، جن کا تعلق کسی نہ کسی جہت سے یونانی طب سے رہا ہے اور اسے ترتیب دیتے وقت ایک اہم کوشش یہ رہی کہ منتخب طور پر مغل اور برطانوی عہد کو اس طرح پیش کیا جائے کہ ان ادوار کی طبی تاریخ کا مکمل عکس سامنے آجائے۔

اکثر طبی تذکروں کو پڑھتے ہوئے برطانوی عہد میں یونانی طب چند خانوادوں میں محصور نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں بہت سے ایسے طبیبوں کی خدمات بھی رہیں، جن کے یہاں کوئی رسمی سلسلہ تو نہیں تھا، مگر انہوں نے تصنیف و تالیف اور تعلیم و تحریک کے میدان میں

بہت اہم کردار ادا کیا اور ان کی کوششوں سے طب کے تحفظ کا اہم سامان ہو سکا اور نئی زمینوں پر اسے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی، حکیم وڈاکٹر غلام جیلانی اور حکیم دلبر حسن خاں نے طبی تعلیم اور تصنیف وتالیف سے لے کر صحافت اور تحریک میں جو کردار ادا کیا ہے، اس سے پنجاب اور لاہور وغیرہ میں یونانی طب کی زمین ہموار ہوئی اور 1947 میں پاکستان کے قیام کے بعد انہیں طبیبوں کی مساعی سے وہاں اس کے احیاء اور فروغ کے امکانات پیدا ہوئے۔ اسی طرح شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن کے ذریعہ مشرقی بنگال میں طبی تعلیم اور تحریک کا آغاز ہوا۔ موجودہ بنگلہ دیش میں یونانی طب کے جس قدر آثار پائے جا رہے ہیں، ان میں بیشتر انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

برطانوی عہد کی طبی تاریخ میں مدرسہ طبیہ، مدرسہ طبیہ زنانہ، ہندوستانی دواخانہ، شعبہ تحقیقات اور مسیح الملک کی نصابی تحریک وغیرہ فنی اصلاح کے حوالے سے نہایت اہم واقعات ہیں، ان سے واقفیت کے بغیر اس عہد کی طبی تاریخ اور رجحانات کو نہیں سمجھا جا سکتا، لہٰذا ان کے مطالعہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔

بلاشبہ اسکول آف یونانی میڈیسن، جامعہ ہمدرد کو حکیم عبد الحمید کے تعاون سے مستحکم بنیاد ملی، لیکن اس کے اوّلین بانی حکیم محمد الیاس خاں، حکیم محمد کبیر الدین اور حکیم فضل الرحمن ہیں، مگر تاریخ میں انہیں شایان شان جگہ نہیں ملی۔ نظامیہ طبیہ کالج حیدر آباد سے جنوبی ہندوستان میں یونانی طب کے فروغ کے امکانات پیدا ہوئے۔ اس کالج کی تعلیمی تنظیم کے سلسلہ میں حکیم محمد کبیر الدین کی مساعی بہت اہم ہیں۔ اس مجموعہ میں حکیم سید جلال الدین امروہوی، حکیم شاہ اہل اللہ پھلتی، حکیم محمد اعظم خاں، حکیم نجم الغنی، حکیم محمد حسن حاذق وغیرہ کی فنی خدمات کو شرح وبسط سے بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان طبیبوں کا بیان عام تذکروں میں کم نظر آتا ہے، لیکن انہوں نے طب کے سلسلہ میں نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ طلبہ کا ان کے کارناموں سے متعارف ہونا تاریخ کی صحیح آگہی کے لیے ضروری ہے۔

مغل اور برطانوی عہد میں فارسی اور اردو میں طبی کتابوں کی منتقلی وقت کا اہم لسانی داعیہ تھا، اس کی تکمیل کے بغیر طبی تعلیم اور تصنیف وتالیف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر مترجمین کے تذکرے طبی تاریخ میں خاطر خواہ اہمیت نہیں پا سکے، جب کہ ان سے آگہی کے بغیر مغل اور برطانوی

عہد کی علمی تاریخ کو سمجھا نہیں جاسکتا۔زیرِ نظر کتاب میں اس پہلو پر بھی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

اِس کتاب کی تالیف میں اس امر کا التزام رہا ہے کہ اس کا مطالعہ قاری کو محض تاریخ سے آگہی نہیں، بلکہ تاریخ فہمی کا شعور بھی عطا کرے اور اس کے مطالعہ سے مغل اور برطانوی عہد کی تمام علمی وفنی سرگرمیوں اور ان کے کرداروں کی قاری کے سامنے پوری تصویر آجائے۔

روایتی کردار کے حامل دیگر علوم کی طرح یونانی طب کی بنیادیں ماضی سے پیوستہ ہیں، لہٰذا طبّی مضامین میں تاریخ کی حیثیت اساسی ہو جاتی ہے،اس کی مناسب تعلیم کے بغیر طب کی معرفت اور بصیرت حاصل نہیں ہوسکتی۔تاریخِ طب کی اس قدر فنی اہمیت کے باوجود اس کی تدریس محض رسم کی ادائیگی اور خانہ پری کے انداز میں ہورہی ہے۔طبّی درس گاہوں کے اس رویے میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

زیرِ نظر مسودہ کئی برس پہلے تیار تھا،لیکن اشاعت کی نوبت اب آرہی ہے۔اس کے گوناگوں موانعات میں ایک سبب مصارف کا بارگراں بھی تھا۔فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی نے دستِ تعاون دراز کر کے اس بوجھ کو کسی قدر ہلکا کر دیا ہے۔اس سلسلے میں کمیٹی کے چیرمین پروفیسر محمد عارف ایوبی صاحب کی بڑی عنایتیں رہیں، جنھیں مبذول کرانے میں عزیزی ڈاکٹر عرفات ظفر اصلاحی (شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اور حکیم سید محمد حسان نگرامی صاحب (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی) کی کوششوں کا کافی دخل رہا۔محترم حکیم وسیم احمد اعظمی صاحب نے نظرِ خوش گزرے کا معاملہ فرما کر پروف دیکھنے کی زحمت کی اور مسودے کی تہذیب میں معاونت فرمائی، اس سلسلے میں عزیزی ڈاکٹر مسرور احمد کا بھی تعاون رہا ہے۔جزاھم اللہ خیر الجزاء !!!

حکیم فخر عالم

(علی گڑھ)

حکیم فخر عالم اور طبی ادب

پروفیسر مولا بخش
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہندوستان میں یونانی طریقۂ علاج کے ارتقاء کی کہانی اور اردو زبان و ادب کے ارتقاء کی داستان میں اس حد تک یکسانیت ہے کہ دونوں میں برادرانہ رشتہ سا لگتا ہے۔ آج کل جب کہ تمام کاروباری اور دفتری امور اور روز مرہ کے دوسرے کاموں کے لیے انگریزی اور ہندی کا استعمال ہو رہا ہے، ان حالات میں بھی اطباء کی تحریروں و تقریروں اور مطبوں میں اردو زبان کا چلن باقی ہے، جو اہلِ طب کی اردو زبان سے بے پایاں دلچسپی اور تعلق کا مظہر ہے۔ اس رشتے کی دوام و استحکام کی کوششیں موجودہ زمانہ میں اردو کے فروغ کے حوالہ سے بڑا اہم کام ہے۔ میرے خیال میں اردو والوں کو آگے بڑھ کر اس رشتے کی مزید استواری کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اردو زبان کو رواج اور فروغ دینے میں طبی برادری کا بڑا اہم حصہ ہے۔ اس وقت جو اطباء فنی خدمت کے ساتھ اردو کے فروغ کا کام بھی انجام دے رہے ہیں، ان میں ایک بے حد قابلِ ذکر نام حکیم فخر عالم کا ہے۔

حکیم فخر عالم سے علی گڑھ میں میری پہلی ملاقات مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکیٹ میں ہوئی، پھر ملاقاتوں کا ایک سلسلہ رہا۔ انہیں قریب سے دیکھنے کے بعد محسوس ہوا کہ وہ بے حد ملنسار اور طبعاً خاکسار ہیں، ساتھ ہی مزاج میں بڑی صاف گوئی ہے اور بے باکی بھی، یہی وجہ ہے کہ حق گوئی میں انہیں کوئی مصلحت مانع نہیں ہوتی۔ مجھے از خود طبی علوم سے دلچسپی رہی ہے، اس لیے مجھے حکماء بے حد عزیز ہیں اور ان سے میں عقیدتاً ملتا رہتا ہوں۔ دلی میں حکیم سید احمد خاں اور

حکیم ضیاء الرحمٰن سے مجھے قربت حاصل رہی ہے اور فخر عالم صاحب کے استادِ گرامی حکیم سیّد ظل الرحمٰن تو میرے لیے ایک آئیڈیل ہیں۔ فخر عالم صاحب کے اندر ان کے استاد کی شرافت نفسی اور علمی شغف، نیز تحقیق کی عرق ریزیاں صاف نظر آتی ہیں۔ اس امر کا اندازہ اس وقت ہوگا جب آپ ان کی کتابوں ''اردو طبی مترجمین'' اور ''ہندوستان کی طبی درسگاہیں'' کا مطالعہ کریں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ علاج و معالجہ کے علاوہ حکیم فخر عالم نے کتنی عرق ریزی سے قدیم طبی درسگاہوں کو صفحۂ قرطاس پر لاکر ہندوستان میں طبی تعلیم کے ان مراکز کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔ ان سے پہلے اسی نوعیت کا کام سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں کیا ہے اور ہندوستانی مسلم بادشاہوں سے متعلق جملہ تاریخی عمارات کو محفوظ کر دیا ہے۔ اردو زبان اور یونانی طب کے لسانی رشتہ کے حوالہ سے حکیم فخر عالم نے صحیح لکھا ہے:

> ''آج یونانی طب کا وسیلۂ اظہار اردو ہے، تو یہ کیوں اور کیسے ہوا، اسے مترجمین کی کوششوں کے مطالعہ کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ چونکہ مستقبل کے لیے بھی ترجمہ ایک بڑی ضرورت ہے، اس لیے کہ اب بھی یونانی طب کا ایک بڑا سرمایہ لسانی اجنبیت کی وجہ سے ناقابل استفادہ ہے اور طاقِ نسیاں میں پڑا ہے، لہٰذا اسے ترجمہ کے پیراہن میں مانوس شکل و صورت دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے جامع لائحۂ عمل کے لیے بھی ماضی کے تراجم اور مترجمین کی مساعی سے آگہی ضروری ہے۔''
>
> (حکیم فخر عالم، اردو طبی مترجمین، ص ۱۲)

''اردو طبی مترجمین'' حکیم فخر عالم کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی حکماء کی علمی تاریخ کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے اطباء کی ادبی دلچسپیوں خصوصاً اردو شعر و ادب سے بھی ان کے گہرے شغف کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں حکیم فخر عالم نے تحقیق کے ذریعہ بہت سے اعتقادات کا رد کیا ہے۔ اس کتاب کی تقریظ میں اس کے محاسن پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر حکیم سیّد مودود اشرف نے صحیح لکھا ہے:

> ''عربوں نے جو کام بطور خاص یونانی طب کے ساتھ کیا، ہندوستان کے

ماہرین فن نے وہی کام عربی، فارسی، سنسکرت کی معتبر کتابوں کے ساتھ کیا، بڑی تعداد میں ان کو اردو قالب میں ڈھالتے چلے گئے۔ ہم اپنے محسنوں کے کارناموں کو نہ جانیں، ان کو یاد نہ رکھیں، ان کی قدر نہ کریں تو اس سے بڑھ کر احسان فراموشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اب تک عملاً یہی ہو رہا تھا۔ اسی لیے مترجمین کے تذکروں کو محفوظ کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش سامنے نہیں آئی۔ حکیم فخر عالم نے اس کمی کی بھرپائی کی ہے۔ ''اردو طبی مترجمین'' لکھ کر انھوں نے دنیائے طب کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ ہم سب ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔ اس کارِ خیر کے لیے وہ ہم سب کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یوں تو ان کے نوکِ قلم سے نکلی ہر کتاب 'کتاب' ہوتی ہے جیسے ''ہندوستان کی طبی درس گاہیں''، ''یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد''، جالینوس کی کتابوں ''علل الاعضا الباطنہ'' اور ''کتاب الیٰ اغلوقن'' کی تہذیب وتدوین اور ترجمہ، رازی کی معروف تالیف ''کتاب الجدری والحصبہ'' کا اردو ترجمہ وغیرہ۔ ان میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو بیش قیمت معلومات کی حامل نہ ہو۔ حکیم فخر عالم کے یہ گرانقدر علمی کام ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز اور منفرد بناتے ہیں۔ یہ ان کے علمی ذوق وشوق، تاریخی شعور، فنی بصیرت، ادبی رجحان، زبان و بیان پر قدرت اور محققانہ ذہن کی بیّن دلیل ہیں۔''

(اردو طبی مترجمین: تقریظ از پروفیسر حکیم سید مودود اشرف، ص:۱۷)

پروفیسر حکیم سید مودود اشرف صاحب کا یہ بیان بالکل حقیقت پر مبنی ہے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اسی قسم کے خیال کا اظہار حکیم وسیم احمد اعظمی نے بھی کیا ہے، ساتھ ہی انہوں نے حکیم فخر عالم کے فکری منہج اور تنقیدی وتحقیقی اسلوب پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

''حکیم فخر عالم نے اپنی اس کتاب میں متعدد مقامات پر اپنے بڑوں کی

تحقیق کی خیر وخبر لی ہے، لیکن اردو طبی ادب میں یہ رجحان ابھی عام نہیں ہے، جب کہ اردو کی دیگر اصنافِ ادب میں نقد ونظر والوں کی ایک معتبر جماعت رہی ہے، محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، امتیاز علی عرشی اور رشید حسن خاں، کچھ ایسے ہی نام ہیں، اوّل الذکر کے علاوہ کو میں نے نہ صرف پڑھا ہے، بلکہ انہیں دیکھنے، سننے اور صحبت اٹھانے کے بھی مواقع ملے ہیں، ان اکابر نے فن کو پرکھنے اور برتنے کا تنقیدی لب ولہجہ دیا ہے۔ لیکن حکیم فخر عالم کی مشکل یہ ہے کہ ان کے پیش رووں نے اردو طبی ادب میں ایسی کوئی روایت نہیں قائم کی، جس کی کسوٹی پر وہ اس کے علمی، فنی اور ادبی سرمایے کو پرکھ سکتے، تاہم حالیہ دنوں میں اس سمت میں کچھ پیش رفت ضرور ہوئی ہے، لیکن ابھی انہیں نشان زد کرنا عاجلانہ قدم ہوگا۔ ان حالات میں اپنے بڑوں کی تحریروں کی خیر وخبر کے لیے لب ولہجہ کا تعین حکیم فخر عالم کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہے، تاہم انھوں نے اس کام کے لیے جو اسلوب اپنایا ہے، اس میں مشرقی آداب کے ساتھ نقد ونظر کی مغربی فکر بھی ہے۔ غلطیوں اور تسامحات کی نشان دہی میں وہ کسی بھی بڑے نام سے مرعوب نہیں ہوتے، بلکہ ان کے اغلاط اور تسامحات کی نشان دہی اور حقائق کی روشنی میں ان کی اصلاح کو عبادتی عمل تصور کرتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے، کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ بڑوں کے نام اور رتبہ کی وجہ سے ان پر جلد ایمان لاتا ہے۔ حکیم فخر عالم شخصیت پسند تو ہیں، لیکن شخصیت پرست قطعی نہیں، ان کی اس شخصیت پسندی میں بھی صالحیت ہے، مصالحت ہرگز نہیں، انھوں نے اپنی اس کتاب میں راقم سطور کی بھی بعض تحریروں میں نقد ونظر کا معاملہ کیا ہے، لیکن انداز 'پکڑ دھکڑ' والا ہرگز نہیں ہے۔''

(اردو طبی مترجمین: تقدمہ از حکیم وسیم احمد اعظمی، ص ۲۵۔۲۴)

اردو ادب کی طرح یونانی طب میں بھی تحقیق و تنقید کی ایک روایت قائم ہے۔ طبی ادب میں اس روایت کی اولین شکلیں حکیم سیّد ظل الرحمٰن کے توسط سے حکیم فخر عالم کے یہاں ایک رجحان کی شکل میں ملتی ہیں۔ حکیم فخر عالم نے ''اردو طبی مترجمین'' میں اپنے اس شعور کا بخوبی مظاہرہ کیا ہے اور اس سلسلے میں فنی دیانت داری کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔

مذکورہ سطور سے حکیم فخر عالم کی تحقیقی بصیرت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اعظم گڑھ ضلع کے موضع بھور مئو میں اپنی آنکھیں کھولنے والے اور آبائی وطن میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج سے بی یو ایم ایس اور ایم ڈی کی ڈگری حاصل کر کے اس وقت وہ یہیں ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن میں سائنٹسٹ لیول۔۳ کے منصب پر فائز ہیں۔ علی گڑھ نے انہیں قدیم و جدید علمی تعمق کا ایک مظہر بنا دیا ہے۔ ان کے بارے میں حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے:

> ''فخر عالم کو تحریر و تقریر پر یکساں دستگاہ حاصل ہے۔ ان کی اب تک نو کتابیں چھپ چکی ہیں، تین زیر طبع ہیں اور غالباً اتنی ہی کتابیں زیر تصنیف ہوں گی یا ان کا خاکہ ذہن میں موجود ہوگا۔ ۶۳ مقالات مقتدر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور کم و بیش اتنے ہی نیشنل، انٹرنیشنل سیمیناروں اور کانفرنسوں میں پیش کر چکے ہیں۔ جواں سال حکیم فخر عالم نے معیاری طبی ادب کی آبیاری کچھ اس ڈھنگ اور آہنگ سے کی ہے کہ بہت جلد صاحب تصنیف اطباء کی صف میں شامل ہو گئے۔
>
> (طبی تذکرے'' حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی، ص ۱۲۸)

حکیم فخر عالم کے مضامین اور کتابوں کو پڑھتے ہوئے ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی خشک عالم کی تحریر ہے، خیال کی صفائی اور عمدہ ترسیل کی وجہ سے ان میں ادبی بلاغت نظر آتی ہے۔ باوجودیکہ ان کی تحریریں ادق موضوعات پر ہیں، مگر زبان و بیان کی شگفتگی نے ان کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ ان کی ایک کتاب ''حکیم سیّد ظل الرحمٰن: ایک مطالعہ'' ہے جو اپنے استاد کی محض خراج عقیدت نہیں ہے، بلکہ پڑھیے تو ایک عالم سے ایک عالم کا مکالمہ معلوم ہوتی ہے۔ لاگ لپٹ کے

بغیر بالکل معروضی نثر اور استدلالی اسلوب سے مزین۔ ٹھیک لکھا ہے اس کتاب میں تعارف لکھتے ہوئے حکیم وسیم احمد اعظمی نے کہ:

> ''ڈاکٹر فخر عالم کی تحریر بہت شگفتہ، دلآویز اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی رجحان رکھتی ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے خوب غور وفکر کرتے ہیں، تاکہ بعد کی ندامت سے محفوظ رہیں۔ تدوین متن اور عصری زبانوں میں ترجمہ ان کا علمی مجال ہے۔ میری معلومات کے مطابق کم وبیش چار قدیم طبی ادب عالیہ کی تدوین وترجمہ میں شریک رہے ہیں۔ پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن کے شیدائیوں میں سے ہیں، ان کا 'عکس خامہ' ایک لائق شاگرد کا اپنے استاذ گرامی کی خدمت میں ایک نذرانہ عقیدت ہے۔'' (تعارف از حکیم وسیم احمد اعظمی، ص ۱۰)

حکیم فخر عالم کی مطبوعات بتاتی ہیں کہ جو قومیں اپنے اسلاف کو بھول جاتی ہیں خود ختم ہو جاتی ہیں، اس لیے ان کا تحفظ ضروری ہے، لہٰذا حکیم فخر عالم کی تمام تحریروں میں اسلاف کے تذکروں کے تحفظ کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔ ''رازیٔ ہند پروفیسر حکیم محمد طیب'' جو نہایت سلیقے سے ترتیب دی گئی ہے، اسی طرح ''نشانِ اجمل''، ''ہندوستان کی طبی درسگاہیں'' اور حکیم سیّد ظل الرحمٰن کی شخصیت پر ان کی کتاب دراصل مینارۂ علمی، ماضی کے تحفظ اور اپنی ثقافت کو اگلی نسل تک پہنچانے کی پُر خلوص کاوش ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ''اردو طبی مترجمین'' بھی ہے اور اسی کی ایک مضبوط اور قابل ذکر کڑی ان کی زیرِ نظر کتاب ''یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد (سولہویں تا انیسویں صدی)'' ہے، جو ملک کے معروف اردو ادارہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے تعاون سے شائع ہو رہی ہے۔ اس کتاب میں حکیم فخر عالم نے تقریباً ۴۵ حکماء کے سوانحی حالات اور طبی خدمات سے روشناس کرایا ہے۔ یہ ان کی بہت بڑی علمی خدمت ہے، ساتھ ہی یہ اردو طبی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

میں نے آغاز میں یہ کہا تھا کہ اردو زبان اور طب یونانی جڑواں بھائی کی طرح ہیں، ان دونوں میں اشتراک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ یکساں تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کی حامل

ہیں اور ان کے عروج وزوال کے عوامل بھی ایک جیسے ہیں۔ ان دونوں نے ہند آریائی اور ہند اسلامی ثقافتی تشکیل میں اہم حصہ لیا۔ حکیم فخر عالم کی زیرنظر کتاب کے مقدمہ سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مقدمہ میں لکھا ہے:

''ہندوستان میں مسلم فاتحین کے داخلہ کے ساتھ یونانی طب کا ورود ہوا۔ اس ملک میں یونانی طب کی آمد اور اس کے فروغ کی تاریخ پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ سوال اکثر اٹھتا ہے کہ اس کی ضرورت یہاں کیوں محسوس کی گئی؟ جب کہ اسی جیسی ساخت کی ایک طب (آیورویدا) پہلے سے موجود تھی، جس سے مسلم نوواردین اپنی معالجاتی ضرورتیں پوری کر سکتے تھے!۔

اس سوال کا ایک ممکنہ جواب یہ ہوسکتا ہے کہ علاج ومعالجہ کے باب میں یہ نوواردین یونانی طریقۂ علاج کے عادی رہے ہوں گے، لہٰذا اپنی ضرورت کا سامان ساتھ لائے۔ مگر یہ جواب تعقل پسندی سے عاری ہے، اس لیے کہ جب انھوں نے ساری ضرورتوں کی تکمیل یہیں سے کی تو طریقۂ علاج کے باب میں ایسا کیوں نہیں؟

دراصل مسلم حکمرانوں کے ساتھ یونانی طب کی آمد کے محرک، معالجاتی تقاضوں سے زیادہ سیاسی داعیے تھے۔ جب کوئی قوم کسی ملک پر فتح حاصل کرتی ہے تو مفتوحہ علاقہ میں اپنے تہذیبی، لسانی اور مذہبی اُمور کو فروغ دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی فکر کے تحت مسلم فاتحین کے دورِ حکومت میں ہندوستان، مسلم تہذیب وثقافت سے روشناس ہوا، یہاں عربی وفارسی نے رواج پایا اور اسلامی مذہب کی نشرواشاعت ہوئی۔ مفتوحہ نوآبادیات میں اپنے تہذیبی آثار اور زبان ومذہب کو رواج دینا دراصل زمینی تسلط کے ساتھ ذہنی اور فکری سطح پر بھی غلبہ کے حصول کا ایک طریقہ ہے۔'' (مقدمہ: یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد، ص ۱۱)

اردو زبان کے فروغ اور تشکیلی عمل میں تیزی اُس وقت آئی جب ہندوستان میں مسلم فاتحین کی آمد ہوئی۔ سنیتی کمار نے لکھا ہے کہ مسلمان نہ بھی آتے تو یہ زبان بن جاتی، مگر اُن کے آنے سے اردو زبان کی تشکیل میں تیزی پیدا ہوئی۔ حکیم فخر عالم نے لکھا ہے کہ ان فاتحین کے داخلہ کے ساتھ یونانی طب کا ورود ہوا۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اردو زبان اور طب یونانی کے حالات میں بڑی حد تک مماثلت اور اشتراک ہے۔ دوسرا اہم نکتہ حکیم فخر عالم نے سوال کرتے ہوئے یہ پیدا کیا ہے کہ جب یہاں آیورویدتھی تو طب یونانی نے اپنی جگہ کیسے بنائی؟، انہوں نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اردو کے لیے بھی ایک سچ ہے، اس لیے کہ فاتح کی ثقافت، علم اور دیگر امور سے مفتوح کا متاثر ہونا اور اس کے لیے جگہ خالی کرنا ایک مسلمہ دستور ہے۔ اسی دستور کے مطابق آیوروید نے یہاں یونانی طب کو جگہ دی، لیکن اس نئی زمین پر طب کے اس پودے کی نمو کے لیے کن چیزوں کی ضرورت تھی اور اس نے کیسے برگ وبار نکالے یہ حکیم فخر عالم سے سنیے:

> ''ایک نئی زمین پر وارد ہونے کے بعد اطباء کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہاں کے تقاضوں سے یونانی طب کو ہم آہنگ کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں اہل فن کے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان کا ادویاتی سرمایہ موجودہ ضرورتوں کے لحاظ سے ناکافی تھا۔ اب تک جو دوائیں ان کے معمول میں تھیں، ان میں بہت سی یہاں دستیاب ہی نہیں تھیں، لہٰذا ان کے متبادل کی تلاش ہوئی۔ فنی لحاظ سے ایک اہم تقاضہ یہ بھی تھا کہ اس ملک کے باشندوں کی معالجاتی ضرورت کا سامان مقامی پیداوار سے ڈھونڈا جائے، اس لیے کہ یہاں کی دوائیں ان کے مزاج سے مطابقت رکھنے کے باعث زیادہ موثر تھیں۔ اس کا ایک آسان حل یہ تھا کہ آیوروید سے مدد لے لی جاتی، اس لیے کہ یہاں کی جڑی بوٹیاں پہلے سے ویدوں کے استعمال میں تھیں، ورنہ نئے سرے سے ادویہ کی تلاش وتحقیق جہاں دقت طلب تھی، وہیں اس کام کے لیے ایک طویل عرصہ بھی درکار تھا۔ یونانی حکماء نے بلاتذبذب ویدک ذخیرۂ عقاقیر سے استفادے کا فیصلہ کیا۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ نہایت آسانی سے ایک بڑے مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا۔
دوسرا فائدہ یہ سامنے آیا کہ اطباء انہیں دواؤں سے علاج و معالجہ کرنے لگے، جن سے یہاں کے باشندے پہلے سے مانوس تھے، لہٰذا ان لوگوں کو یونانی طب اپنانے میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی اور آسانی سے یونانی طب ہندوستانی باشندوں کے ذریعہ قبول کر لی گئی۔ چونکہ یونانی اور ویدک کے فنی اسالیب بہت حد تک یکساں ہیں، اس لیے یونانی طب کو آیورویدسے استفادے میں کسی مغایرت کا احساس نہیں ہوا۔''

(مقدمہ: یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد، ص۱۲)

مذکورہ اقتباس میں صاف طور سے آیوروید سے یونانی طب کے اخذ و قبول کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح اطباء انہیں دواؤں سے علاج و معالجہ کرنے لگے جن سے یہاں کے باشندے پہلے سے مانوس تھے۔ اس عہد میں تہذیب و معاشرت کے سلسلے میں بھی ایک دوسرے سے لین دین ہوا۔ جیسے مسلم صوفیوں نے ہندوستانی سادھوؤں کا لباس تک اختیار کر لیا تھا اور عوام سے رابطے کے لیے مقامی زبان سیکھی، اس قسم کے تعاملات نے گنگا جمنی تہذیب کی تشکیل کی۔ مگر جب اس ملک پر ایک نئی قوم نے دھاوا بول کر اسے غلام بنا لیا تو صحیح معنوں میں کلونیزم کی کریہہ شکل سامنے آئی، جہاں فاتح نے سرے سے مشرقی طرز بود و باش، طرز علم، طرز ثقافت کو فرسودہ قرار دیا جس کی زد میں یونانی طب بھی آئی۔ جس طرح ادبی صنف ڈرامے کے لیے فلم چیلنج بن گئی اسی طرح ایلوپیتھک نے جو انگریز لائے تھے، طب یونانی کو قصۂ پارینہ بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، لیکن یہ اپنے ساختیاتی میکانزم کی وجہ سے ایسی سخت جان تھی کہ یہ ختم تو نہ ہوئی البتہ نظر انداز ضرور ہونے لگی تھی، اس عہد میں یونانی طب کو تحفظ فراہم کرنے کے سلسلے جو کوششیں ہوئی ہیں، ان کے بارے میں حکیم فخر عالم لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ء میں مغل حکومت کے علامتی اختتام اور برطانوی تسلط کے بعد جو دور شروع ہوا، اس میں یونانی طب کو بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ رہا کہ اس کی سائنسی حیثیت پر سوالیہ نشان

قائم کر کے اسے ماضی کی ایک داستان قرار دے دیا گیا۔ ان حالات میں یونانی طب کو باقی رکھنے کے لیے اسے معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ برطانوی عہد کے تعلیمی نظام اور تصنیف و تالیف کے مطالعہ سے جو رجحان سامنے آتا ہے، اس میں اصلاح و تجدید کا پہلو بہت نمایاں ہے۔

اس زمانہ میں دانشور طبیبوں نے اصلاح و تجدید کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے جو فوری اقدام کیے، ان میں جدید طبی مضامین سے اخذ و استفادہ کو ایک اہم اصلاحی عمل کے طور پر اپنایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی طب میں جدید سائنسی اثرات بہت واضح نظر آتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد ایک نمایاں تبدیلی یونانی طب کے تعلیمی میدان میں دکھائی دیتی ہے اور نظام تعلیم کے حوالہ سے اس کی تنظیم کا رجحان سامنے آتا ہے۔ اسی طرح برطانوی عہد میں طب کے روایتی تعلیمی نظام کی جگہ ایک ایسا طریقۂ تعلیم متعارف ہوا، جو سابقہ روایتی انداز سے مختلف اور ہٹ کر تھا۔

تعلیم و تحقیق سے لے کر تصنیف و تالیف تک کے تمام شعبوں میں برطانوی عہد میں جو اصلاحی اقدام ہوئے ہیں، ان میں طب جدید سے استفادہ کا عنصر سب سے زیادہ ہے اور کہیں کہیں یہ اتنا غالب ہے کہ طبی فلسفہ کی روح ختم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ غالباً یہ اس لیے ہوا کہ طب جدید سے استفادہ کا فیصلہ اتنی عجلت میں کیا گیا کہ اس کے حدود و قیود متعین ہونے سے رہ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلاح کے نام پر بہت سی چیزیں جدید طبی سائنس سے لے کر یونانی طب میں چسپاں کر دی گئیں۔"

(مقدمہ: یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد، ص ۱۵-۱۴)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ یہ کتاب ۴۵ اطباء کے سوانحی حالات اور ان کی علمی و فنی

مساعی پر مشتمل ہے۔اس میں ان طبیبوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے جنھوں نے برطانوی عہد میں طب یونانی کوموت کے منہ سے نکالا تھا۔اسے مصنف کی زبانی سنیے:

''خانوادوں سے تعلق رکھنے والے طبیبوں کواہمیت دینے کے ساتھ ایسے غیر روایتی طبیبوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، جن سے برطانوی عہد میں یونانی طب کوسہارا ملا۔

اطباء کے سوانحی حالات کے ذیل میں ایسے پہلوؤں پر توجہ کی گئی ہے، جن کا تعلق کسی نہ کسی جہت سے یونانی طب سے رہا ہے اوراسے ترتیب دیتے وقت ایک اہم کوشش یہ رہی کہ منتخب طور پر مغل اور برطانوی عہد کواس طرح پیش کیا جائے کہ ان ادوار کی طبی تاریخ کا مکمل عکس سامنے آجائے۔

اکثر طبی تذکروں کو پڑھتے ہوئے برطانوی عہد میں یونانی طب چند خانوادوں میں محصور نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں بہت سے ایسے طبیبوں کی خدمات بھی رہی ہیں، جن کے یہاں کوئی رسمی سلسلہ تونہیں تھا،مگر انھوں نے تصنیف وتالیف اور تعلیم وتحریک کے میدان میں بہت اہم کردار ادا کیا اوران کی کوششوں سے طب کے تحفظ کا اہم سامان ہوسکا اورنئی زمینوں پراسے متعارف ہونے کا موقع ملا۔شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی، حکیم وڈاکٹر غلام جیلانی اور حکیم دلبر حسن خاں نے طبی تعلیم اور تصنیف وتالیف سے لے کر صحافت اور تحریک میں جو کردار ادا کیا ہے، اس سے پنجاب اور لاہور وغیرہ میں یونانی طب کی زمین ہموار ہوئی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کے بعد انہیں طبیبوں کی مساعی سے وہاں اس کے احیاء اور فروغ کے امکانات پیدا ہوئے۔اسی طرح شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن کے ذریعہ مشرقی بنگال میں طبی تعلیم اور تحریک کا آغاز ہوا۔موجودہ بنگلہ دیش میں یونانی طب کے جس قدر آثار پائے جارہے

ہیں، ان میں بیشتر انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

برطانوی عہد کی طبی تاریخ میں مدرسہ طبیہ، مدرسہ طبیہ زنانہ، ہندوستانی دواخانہ، شعبۂ تحقیقات اور مسیح الملک کی نصابی تحریک وغیرہ فنی اصلاح کے حوالے سے نہایت اہم واقعات ہیں، ان سے واقفیت کے بغیر اس عہد کی طبی تاریخ اور رجحانات کو نہیں سمجھا جاسکتا، لہٰذا ان کے مطالعہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔''

(مقدمہ: یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد، ص ۱۶۔۱۵)

مغلوں اور انگریزوں کے طرز حکومت میں ایک بڑا فرق یہ محسوس ہوتا ہے کہ مغلوں کے یہاں تعمیری رجحان ملتا ہے جب کہ انگریزوں کے یہاں استعماریت نظر آتی ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے مشرق کے ہر مینارۂ علم پر خاک ڈالنے کی سعی کی۔ حکیم فخر عالم کی یہ کتاب اس گرد کو جھاڑنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ برطانوی عہد میں یہ علم اور طریقۂ علاج کا یہ شعبہ کیسے اور کن لوگوں کی وجہ سے محفوظ رہا، یہ کتاب اس تاریخی واقعہ کی صداقت بیان کرتی ہے۔

ہندوستان کے حکماء نے اصناف ادب میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور وہ اردو زبان و ادب کے محافظ بھی رہے ہیں۔ طبیب شاعر کے طور پر مومن خاں مومن نے بڑی شہرت پائی ہے، حالانکہ حکیم شعراء کی ایک لمبی فہرست خود حکیم فخر عالم کی کتاب ''اردو طبی مترجمین'' میں اور زیر نظر کتاب میں بھی ایسے بہت سے نام ملتے ہیں۔ شفائی، حکیم احسن اللہ، حاذق میرٹھی، نجم الغنی، حکیم ماہر وغیرہ طبیب کے ساتھ اچھے شاعر بھی رہے ہیں۔ حکیم فخر عالم کی کتاب ''اردو طبی مترجمین'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم محمد حسن حاذقؔ میرٹھی نے ناول کے طرز پر طبی کتابوں کی تالیف کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ حکیم فخر عالم لکھتے ہیں:

''علاج النساء معروف بہ گل عباسی، یہ نہایت منفرد تصنیف ہے، جو بطرز ناول لکھی گئی ہے، اس کتاب میں حکیم محمد حسن حاذقؔ نے حکیم علی عباس عرف مسیح الزماں کی صاحبزادی، عصمت پناہی عباسی بیگم کے حالات زندگی اس طرح پیش کیے ہیں کہ اس کے ذیل میں جملہ زنانہ طبی مسائل کا احاطہ

متعلق ہو گیا ہے۔ امراض کے ساتھ ان کے اسباب وعلامات اور ان سے متعلق نسخہ جات کی تفصیل بھی آ گئی ہے۔ اس طرح نہایت دلچسپ انداز میں حکیم حسن حاذقؔ نے خواتین کو نسوانی طبی معلومات سے واقفیت بہم پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔

مختلف صحی مسائل کے تئیں عوام میں بیداری اور شعور پیدا کرنے کے لیے موجودہ عہد میں نکڑ ناٹکوں اور ڈاکیومنٹری فلموں کا سہارا لیا جا رہا ہے، مغربی ممالک میں مختلف سائنسی اور طبی موضوعات پر کثرت سے فلمیں بن رہی ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تفریح کے ساتھ طبقۂ عوام میں سائنس اور صحی امور کی بابت بیداری پیدا کی جائے۔ جدید دنیا میں جو کام گزشتہ چند دہائیوں سے ہو رہا ہے، حکیم محمد حسن حاذقؔ نے اسے ایک صدی پہلے انجام دیا ہے۔ اس سے ان کی پیش بینی اور حذاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔" (حکیم فخر عالم، اردو طبی مترجمین، ص ۸۸)

اہلِ اردو کو چاہیے کہ حکیم محمد حسن حاذقؔ کی اس کتاب کا مطالعہ کریں اور اردو کے محققین کے ذریعہ اردو ناول کے ارتقاء میں اس کا باقاعدہ ذکر ہو۔ اردو اور یونانی طب کا باہمی رشتہ ہماری علمی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اردو زبان کے فروغ میں طب یونانی اور طب یونانی کے فروغ میں اردو زبان نے بطور میڈیم اہم رول ادا کیا ہے۔ اس امر کی روشن مثال زیرِ نظر کتاب "یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد" ہے، جو حکیم فخر عالم کا تازہ ترین تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ ہے۔ اسے مختصر سوانح نگاری کا عمدہ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سوانحی ادب کے حوالہ سے حکیم فخر عالم کی دوسری کتابیں بھی بے حد اہم ہیں، اہلِ اردو کی طرف سے ایسے کاموں کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

☆

محمد بن یوسف ہروی

محمد بن یوسف ہروی (وفات 949ھ مطابق 1542ء) مغلیہ عہد کے ابتدائی ترین طبیبوں میں ہے۔ وہ بابر کے ہمراہ 1526ء میں ہرات سے ہندوستان آیا۔ اس کا شمار ہرات اور خراسان کے اکابر اطباء میں تھا۔ مغل دربار سے وابستگی کی وجہ سے وہ یہاں بھی ممتاز رہا۔

بحرالجواہر:

محمد بن یوسف ہروی نے طبی حلقہ میں اپنے لغت 'بحرالجواہر' کے ذریعہ شہرت پائی۔ اس کا شمار مشہور طبی لغات میں ہے۔ حکیم نیر واسطی کی اطلاع کے مطابق یہ لغت پہلی بار مطبع علوی لکھنؤ سے 1872ء میں چھپا تھا۔ اس کی ایک اشاعت 1922ء میں مطبع نامی لکھنؤ سے ہوئی ہے۔ 1312ھ مطابق 1896ء میں یہ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ مطبع مجتبائی کا دعویٰ ہے کہ سابقہ اشاعتوں میں کافی غلطیاں تھیں، چنانچہ اس نے بحرالجواہر کے مطبوعہ اور قلمی نسخوں کی مدد سے یہ صحیح نسخہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہروی نے یہ لغت ہرات کے علم دوست وزیر امیر بیگ کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ اس کی جمع وترتیب میں اس نے الشفا، قانون، شروح قانون، قاموس، دستور، حاوی، موجز، شروح موجز، منہاج، تقویم، جامع، مجموع اللغۃ، ینابیع، مہذب، مغرب، تاج، دیوان، نزہۃ الارواح، عین الخلیل، صحاح، صراح، جیسی کتابوں سے مدد لی ہے۔ اس لغت کی تدوین کے وقت ہروی نے مذکورہ کتب سے اَخذِ مواد کے علاوہ معاصر علماء وماہرین طب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ 'بحرالجواہر' کا شمار اہم طبی لغات میں ہوتا ہے۔ طبی اصطلاحات کی توضیح وتفہیم کے سلسلہ میں یہ اطباء کے استفادہ کا ایک اہم مرجع رہا ہے۔

'بحر الجواہر' کے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہروی کے پیش نظر کوئی طبی لغت نہیں تھا۔ اس لحاظ سے 'بحر الجواہر' لغت نویسی کا ابتدائی نمونہ ہے۔ لہٰذا اس میں لغزشوں کا قوی امکان ہے، اگر کچھ غلطیاں در آئی ہیں تو اس سے اس کی افادی حیثیت کم نہیں ہوتی ہے۔ حکیم اجمل خاں نے 1916ء میں 'مقدمۃ اللغات الطبیہ' لکھا تھا۔ یہ طبی لغت نویسی کے موضوع پر ایک اہم رسالہ ہے۔ اس کی حیثیت طبی لغت کے کلیات کی ہے، جس میں لغت نویسی کا خاکہ اور اس کے اصول و ضوابط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حکیم اجمل خاں نے اس مقدمہ میں بحر الجواہر کی خامیوں پر سخت تنقید کی ہے۔

مطبع مجتبائی سے شائع 'بحر الجواہر' 238 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ہروی کا تحریر کردہ ایک مختصر مقدمہ ہے، جس میں حمد و ثنا کے بعد کتاب کے مستفاد مراجع، ہرات کے ملکی حالات، امیر بیگ کی فرمائش اور اس کی علمی عنایتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس لغت کی ابتدا آطریلال سے اور اختتام لفظ یونان پر ہوا ہے۔

عین الحیوٰۃ:

ہروی کی دوسری اہم کتاب 'عین الحیوٰۃ' ہے۔ یہ 1532ء کی تالیف ہے۔ یہ Geriatric کے موضوع پر ہے۔ اس میں ان دواؤں اور تدبیروں کا بیان ہے جو عمر کو بڑھاتی ہیں اور بڑھاپے کی رفتار کو سست کرتی ہیں۔ اسی طرح ان چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو عمر کم کرتی ہیں اور بڑھاپا جلد لاتی ہیں۔ اس میں 99 دواؤں کے علاوہ استفراغ، احتباس، ریاضتِ معتدلہ، سفر، سکونت، موسیقی، صید، غذاءِ معتدل، لعب، لقاءِ محبوب، مسکن عالی، ہواءِ معتدل اور نوم کو بھی ان چیزوں میں شمار کرایا ہے، جن سے درازیٔ عمر میں مدد ملتی ہے۔ اس کے مطابق اگر انسان حفظِ صحت کے اصولوں پر عمل کرے تو وہ طبعی عمر ایک سو بیس برس تک زندہ رہ سکتا ہے۔

یہ Geriatric کے موضوع پر یونانی طب کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ سے شیخوخت کے بارے میں یونانی طب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور بہت سی مانع شیخوخت دواؤں اور تدابیر کا علم ہوتا ہے۔

حکیم سید ظل الرحمان نے اس کے متن کو مدون کر کے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ 2007ء میں ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد (حیدر آباد) نے افادی دائرہ کو وسیع کرنے کی غرض سے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا ہے، جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ محمد بن یوسف ہروی کا شمار مغلیہ عہد کی طبی تاریخ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی شخصیت کا مطالعہ بے حد اہم ہے۔

مطالعاتی ماخذ

1۔ بحر الجواہر، محمد بن یوسف ہروی، مطبع مجتبائی، دہلی، 1312 ہجری

2۔ عین الحیوٰۃ، محمد بن یوسف ہروی، ترجمہ وتدوین حکیم سید ظل الرحمن، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، 2007ء

3۔ حکیم اجمل خاں کی علمی خدمات، محمد رضی الاسلام ندوی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 2004ء

4۔ حکیم سید ظل الرحمن: ایک مطالعہ، حکیم فخر عالم، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، 2010ء

5۔ تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان، حکیم نیر واسطی، موسسہ مطالعات تاریخ پزشکی، طب اسلامی و مکمل، ایران، بہمن ماہ 1382 ہجری شمسی

یوسف بن محمد ہروی

یوسف بن محمد ہروی، صاحب بحرالجواہر محمد بن یوسف ہروی کا بیٹا ہے۔ مغلیہ دور میں وسط ایشیا کے مختلف شہروں سے جو اطباء ہندوستان آئے، ان میں ہرات سے آنے والے دو طبیب محمد بن یوسف ہروی اور یوسف بن محمد ہروی نہایت قابل ذکر ہیں۔ ان باپ بیٹوں سے مغلیہ عہد کی طبی اور علمی تاریخ کو بڑا فروغ ملا۔

یوسف بن محمد ہروی اپنے باپ کی طرح نہایت ذی علم تھا، اس کی آمد سے مغلیہ دور میں طبی تصنیف و تالیف کا رواج ہوا۔ وہ بابر کے عہد 1526ء میں اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان آیا۔ قادر الکلام شاعر تھا، یوسفی تخلص تھا۔ یہ حکیم یوسفی کے نام سے مشہور ہے۔ شعر و ادب اور انشاء کے ساتھ طبی کتابوں کی تصنیف کا بہت عمدہ اور پختہ ذوق رکھتا تھا۔ اس نے طب کے مختلف موضوعات پر جو رسائل قلم بند کیے ہیں، وہ منظوم اور منثور دونوں صورتوں میں ہیں۔ ان کے مطالعہ سے نظم و نثر میں یوسف بن محمد ہروی کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سائرل الگوڈ کے مطابق ہمایوں کے عہد میں اس نے بادشاہ کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی ہیں۔

طبی اور غیر طبی موضوعات پر حکیم یوسفی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رسائل کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1۔ اصل الاصول:

یہ ایک مختصر رسالہ ہے، جو 36 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں معالجین کے لیے کچھ حدود و شرائط کا بیان ہے۔

2۔ دلائل البول:

یہ رسالہ پیشاب کے امتحان سے متعلق ہے۔اس کا سنہ تالیف 1535ء ہے۔ یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے۔

3۔ دلائل النبض:

یہ رسالہ نبض کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ ہندوستان میں 1535ء میں تالیف کیا گیا تھا۔ یہ ایک منظوم رسالہ ہے۔

4۔ فوائد الاخیار:

48 صفحات پر محیط حفظانِ صحت کے بیان پر مشتمل یہ مطبوعہ منظوم رسالہ حکیم یوسفی نے ہندوستان آنے سے پہلے 1507ء میں تالیف کیا تھا۔

5۔ علاج الامراض:

یہ ایک منظوم رسالہ ہے۔اس میں رباعیوں کی صورت میں علاج و معالجہ کا بیان ہے۔ یہ 917 ہجری مطابق 1511ء کی تالیف ہے۔

6۔ جامع الفوائد:

یہ مذکورہ رسالہ 'علاج الامراض' کی شرح ہے۔ یہ منظوم اور منثور دونوں صورتوں میں ہے۔اس میں امراض کی تعریف، علامات اور علاج کا تذکرہ ہے۔علاج کا بیان رباعی کی صورت میں کیا ہے۔ یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے۔

7۔ قصیدہ در حفظِ صحت:

حکیم یوسفی نے حفظانِ صحت کے مختلف اصولوں کو نظم کی صورت میں بیان کیا ہے۔اسے اس نے بابر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے۔

8۔ رسالۂ ماکول و مشروب:

اس رسالہ میں مثنوی کی صورت میں ماکولات و مشروبات کا تذکرہ ہے۔ یہ رسالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

9۔ ریاض الادویہ:

یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے۔اس میں مصنف نے مفرد اور مرکب دواؤں کو حروف تہجی کی

ترتیب پر بیان کیا ہے۔ یہ 1540ء کی تالیف ہے اور ہمایوں کے نام معنون ہے۔

10۔ ستۂ ضروریہ:

یہ رسالہ بھی ہمایوں کے نام معنون ہے۔ یہ رسالہ 1538ء میں تالیف کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے۔

11۔ امراضِ چشم:

یہ رسالہ آنکھ کے امراض اوران کے علاج سے متعلق ہے۔

12۔ طب یوسفی:

یہ کوئی مستقل کتاب نہیں، بلکہ ہروی کے آٹھ رسائل کا مجموعہ ہے۔ حکیم نیر واسطی نے اس کا ذکر 'رسائل یوسفی' کے نام سے کیا ہے۔

13۔ بدائع الانشاء:

یہ انشاءِ یوسفی کے نام سے بھی معروف ہے۔ یہ ایک غیر طبی تالیف ہے۔ اسے ہروی نے اپنے بیٹے رفیع الدین کے لیے لکھا تھا۔ یہ علم بلاغت اور انشاء سے متعلق ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ تاریخ طب واطباء دور مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

2۔ عین الحیوٰۃ، محمد بن یوسف ہروی، ترجمہ وتدوین حکیم سید ظل الرحمٰن، ابن سینا اکیڈمی علی گڑھ، 2007ء

3۔ تاریخ روابط پزشکی ایران وپاکستان، حکیم نیر واسطی، موسسہ مطالعات تاریخ پزشکی، طب اسلامی ومکمل، بہمن ماہ 1382 ہجری شمسی

حکیم الملک شمس الدین گیلانی

گیلان سے ہندوستان آنے والے طبیبوں میں حکیم الملک شمس الدین گیلانی ایک اہم نام ہے وہ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ اس زمانہ میں جن طبیبوں نے درس وتدریس کے ذریعہ یونانی طب کی اشاعت میں حصہ لیا ہے، ان میں حکیم الملک شمس الدین گیلانی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اس زمانہ میں مدارس اور مکاتب کے بجائے حکماء کے مطب اور ان کے گھر ہی درس گاہ ہوتے تھے۔ حکیم الملک شمس الدین گیلانی کو اکبری عہد کا طبی اسکول کہا جا سکتا ہے۔ تعلیم وتدریس اس کا خاص مشغلہ تھا۔ وہ اپنے گھر پر طلبہ کو طب اور دیگر عقلی علوم کی تعلیم دیتا تھا۔ اس کا حلقۂ درس کافی وسیع تھا۔ اُس نے درس وتدریس سے اپنے آپ کو اس قدر جوڑ رکھا تھا کہ لوگوں کے یہاں آنے جانے سے احتراز کرتا تھا کہ کہیں اس سے طلبہ کی تعلیم متاثر نہ ہو۔

جو طلبہ اس کے یہاں زیرِ تعلیم ہوتے، ان کے ساتھ اس کا رویہ نہایت مشفقانہ ہوتا اور وہ ان کو اپنے سے قریب رکھتا تھا۔ انہیں اپنے دسترخوان پر مدعو کرتا اور ان کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔

حکیم علی گیلانی، جو القانون فی الطب کا دوسرا مکمل شارح ہے، وہ شمس الدین گیلانی کا بھانجہ تھا۔ اس نے بھی حکیم الملک شمس الدین گیلانی سے تعلیم پائی تھی۔

تذکرہ نگاروں نے حکیم الملک شمس الدین گیلانی کے جو سوانحی حالات نقل کیے ہیں انہیں پڑھ کر شمس الدین کی شخصیت میں ایک مثالی استاذ کا مشاہدہ ہوتا ہے اور استاذ اور شاگرد کے درمیان، صحیح رشتوں کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ وہ علوم حکمیہ کا بہت بڑا عالم تھا، منطق وفلسفہ اور فنونِ نظری کے سلسلہ میں اس کی شخصیت بے نظیر تھی۔ نحو، فقہ اور اصول فقہ میں نہایت عمدہ صلاحیتوں کا

مالک تھا۔ اس نے ہمیشہ درس وتدریس سے خود کو جوڑے رکھا۔

ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں کہ وہ حکمت اور طب میں جالینوسِ وقت اور مسیح الناس تھا، علوم نقلی و رسمی میں اچھی دستگاہ رکھتا تھا۔

حکیم الملک شمس الدین گیلانی، اکبر کے دربار سے منسلک تھا، وہاں اس نے اپنے غیر معمولی علم وفضل سے بڑی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ مگر وہ مذہبی رجحان رکھتا تھا اور اکبر کے یہاں مذہبی آزاد خیالی تھی۔ اس فکری تصادم کی وجہ سے یہاں کی فضا اسے زیادہ راس نہیں آئی اور وہ سفر حج کے بہانے 988 ہجری مطابق 1580ء میں مکہ چلا گیا اور وہیں اقامت پذیر ہو گیا۔ حالانکہ اکبر نے طلبی کا فرمان بھی بھیجا، مگر وہ واپس نہیں لوٹا۔ حجاز میں اس نے وفات پائی۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ نزہۃ الخواطر جلد 4، عبد الحئی حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدر آباد، 1989ء

2۔ اطباءِ عہدِ مغلیہ، حکیم کوثر چاند پوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

3۔ تاریخ طب و اطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

حکیم ابوالفتح گیلانی

اس کا نام مسیح الدین اور کنیت ابوالفتح تھی، وہ گیلان کے علاقہ لاہیجان کا رہنے والا تھا۔ وہیں اس نے نشوونما پائی۔ حکیم عمادالدین محمود شیرازی اور دوسرے علماء سے تعلیم حاصل کی اور علم و فضل میں کمال پیدا کیا۔

حکیم ابوالفتح گیلانی کے والد مولانا عبدالرزاق فاضل اور یگانۂ عصر تھے، انہیں حکمتِ نظری اور الٰہیات میں دستگاہ حاصل تھی۔ مولانا عبدالرزاق، خاں احمد فرمانروا گیلان کے عہد میں صدرالصدور کے جلیل القدر عہدے پر مامور تھے۔ 974 ہجری مطابق 1566ء میں شاہ طہماسپ نے گیلان پر قابض ہو کر وہاں کے فرمانروا اور ریاست کے دیگر وفاداروں کو پابندِ سلاسل کر لیا۔ دیگر اراکین کے ساتھ مولانا عبدالرزاق بھی قید ہوئے اور بحالتِ اسیری وفات پائی۔

شاہ طہماسپ کے دورِ حکومت میں ابوالفتح گیلانی کے خاندان کو سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ والد مولانا عبدالرزاق کے انتقال کے بعد ابوالفتح کے خاندان نے گیلان سے ہجرت کر کے ہندوستان میں پناہ لی۔ اس زمانہ میں ایرانی فضلاء کے لیے ہندوستان ایک اہم جائے قرار تھی۔ ابوالفتح کے ہمراہ حکیم نجیب الدین ہمام اور حکیم نورالدین بھی تھے۔ ابوالفتح کا ایک بھائی حکیم لطف اللہ پہلے ہی ہندوستان آ چکا تھا۔

ہندوستان آ کر ابوالفتح نے اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت بہت جلد دربار میں قرب و اختصاص کا مرتبہ حاصل کر لیا۔

عبدالقادر بدایونی کے مطابق ابوالفتح، اکبر سے اپنے قرب و تعلق اور اس کے مزاج میں دخیل ہونے کی وجہ سے دربار کے دوسرے وابستگان کی نظر میں محسود ہو گیا تھا۔ بادشاہ سے ابوالفتح

کے قرب واختصاص کے متعلق مؤلف مآثرِ رحیمی لکھتے ہیں کہ اسے اکبر کے دربار میں وہی اثر ورسوخ اور مرتبہ حاصل تھا جو ہارون رشید کے نزدیک جعفر برمکی کا تھا۔

اکبر کے معتمدین میں حکیم ابوالفتح نہایت معزز اور ممتاز تھا۔ مصاحب اور درباری طبیب کے علاوہ وہ اکبر کا مشیر بھی تھا۔ 993 ہجری مطابق 1585ء میں اسے ہشت صدی منصب عطا ہوا۔ اگرچہ یہ ہزاری منصب پر فائز نہیں تھا، مگر بادشاہ کی نگاہ میں اس کی بے حد عزت وتوقیر تھی اور اکبر اس کی رائے اور مشورے کی بے حد قدر کرتا تھا۔

حکیم ابوالفتح ایک حاذق طبیب تھا۔ طب کے علاوہ فلسفہ اور علم نجوم سے بھی گہری واقفیت رکھتا تھا۔ ابوالفضل جیسے نقادِ سخن نے اس کے علمی کمالات کی تعریف کی ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی جیسے مخالف نے بھی اس کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے۔ حالانکہ بدایونی نے ابوالفتح کے اخلاق کی مذمت بھی کی ہے۔

ابوالفتح خود صاحبِ علم تھا اور اہلِ علم کا قدرداں تھا۔ اسے شاعری کا عمدہ ذوق بھی تھا۔ عرفی شیرازی، خواجہ حسین ثنائی خراسانی، مرزا علی قلی میلی اور حیاتی گیلانی وغیرہ اس کی معارف پروری سے فیض یاب ہوئے ہیں اور اکبر کے دربار تک ان کی رسائی میں ابوالفتح کی کوششیں بے حد اہم ہیں۔

صاحبِ علم وفضل ہونے کے ساتھ ابوالفتح مردِ میداں بھی تھا اور دو معرکوں میں شریک رہا ہے۔

تصانیف

1۔ فتاحی:

یہ قانونچہ (علامہ چغمنی) کی شرح ہے۔ تقریباً ساڑھے چار سو صفحات پر محیط ہے۔

2۔ قیاسیہ:

یہ نصیرالدین طوسی کی تالیف اخلاق ناصری کی شرح ہے۔ اس میں ابوالفتح نے اخلاقِ ناصری میں درج فلسفیانہ مسائل کو نقلی دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے۔ یہ کتاب چودہ سو صفحات پر محیط ہے۔

3۔ چارباغ:

یہ ابوالفتح گیلانی کے خطوط کا مجموعہ ہے، جو اس نے فیضی، ابوالفضل، حکیم ہمام، خانِ خاناں وغیرہ کو لکھے تھے۔ ان خطوط میں حکیم ابوالفتح گیلانی نے مختلف مسائلِ حکمیہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

4۔ طبِ ابوالفتح:

یہ حکیم ابوالفتح کے معمولات اور مجربات کا مجموعہ ہے۔ اس کا خطی نسخہ 'رسالہ طب المجربات' کے نام سے لاہور یونیورسٹی، پاکستان میں موجود ہے۔

5۔ افاداتِ حکیم ابوالفتح:

یہ مختلف موضوعات پر حکیم گیلانی کے افکار و خیالات کا مجموعہ ہے۔

997 ہجری مطابق 1589ء میں اکبر کے ہمراہ کابل جاتے ہوئے قصبہ دھمتور میں وفات پائی۔ خواجہ شمس الدین خوانی نے حکیم گیلانی کی لاش کو حسن ابدال (اسلام آباد، پاکستان کے اطراف میں واقع ہے) میں سپرد خاک کیا۔ اس کی قبر پر تعمیر گنبد آج بھی موجود ہے۔ کابل سے واپسی پر جب اکبر حسن ابدال پہنچا تو وہ ابوالفتح کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا۔

مطالعاتی ماخذ

1۔ منتخب التواریخ، عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، ایران، 1379 ہجری شمسی

2۔ نزہۃ الخواطر جلد 4، عبدالحئی حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، 1989ء

3۔ تاریخ روابطِ پزشکی ایران و پاکستان، حکیم نیر واسطی، عکسی اشاعت موسسہ مطالعات تاریخ پزشکی طبِ اسلامی و مکمل ایران، بہمن ماہ 1382 ہجری شمسی

4۔ تاریخ طب و اطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

5۔ اطباءِ عہدِ مغلیہ، حکیم کوثر چاند پوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

حکیم شاہ فتح اللہ شیرازی

فتح اللہ بن شکر اللہ شیرازی اکبر کے متوسلین میں نہایت معتبر اور مقرب تھا۔ اکبر کا رویہ فتح اللہ کے ساتھ نہایت تکریم اور قدر و احترام کا تھا۔ اکبر سے وابستگی سے پہلے فتح اللہ بیجاپور کے فرمانروا عادل شاہ کے دربار سے منسلک تھا۔ عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا کم سن بیٹا سریر آراءِ سلطنت ہوا، مگر وہ وزیروں کی کٹ پتلی بن گیا، اسی زمانہ میں فتح اللہ اکبر کی دعوت پر فتح پور سیکری آیا۔

فتح اللہ شیرازی غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا، اکبر کی نگاہوں نے اس کی صلاحیتوں کو پرکھ لیا۔ چنانچہ 993 ہجری (مطابق 1585ء) میں اکبر نے اسے منصبِ صدارت عطا کر کے امین الملک، پھر عضد الدولہ بعد ازاں عضد الملک کے خطابات عطا کیے اور اسے زمرۂ اُمراء میں شامل کر لیا۔

اکبر نے راجہ ٹوڈرمل کو ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ انتظامی معاملات کو فتح اللہ کے مشورہ سے انجام دیا کرے۔ اس واقعہ سے فتح اللہ کی اصابتِ رائے اور غیر معمولی انتظامی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے اور اس پر اکبر کس درجہ اعتماد کرتا تھا، اس کا پتہ چلتا ہے۔

ابن مبارک لکھتا ہے فتح اللہ ایک بے نظیر شخصیت کا حامل تھا۔ اسے علومِ حکمیہ میں اتنا کمال تھا کہ اگر یہ علوم مٹ بھی جاتے تو وہ انہیں از سرِ نو منضبط کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

علومِ حکمیہ کے علاوہ ٹکنالوجی کے میدان میں اُسے درک و مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ اس نے غلہ پیسنے کے لیے بغیر مشین کے از خود چلنے والی چکی بنائی تھی۔ اس نے ایک آئینہ بھی بنایا تھا، جس میں دیکھنے سے عجیب و غریب شکلیں نظر آتی تھیں۔ اس نے ایک ایسی بندوق بھی بنائی تھی جو ایک راؤنڈ میں بارہ فائر کرتی تھی۔ ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی اور ملکی اُمور میں

مہارت اور علوم میں کمال کے ساتھ فتح اللہ شیرازی سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بھی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا۔

اکبری عہد کے مشہور مورّخ ابو الفضل نے طب کے علمی اور عملی شعبوں میں فتح اللہ شیرازی کی مہارت کا ذکر کرتے ہوئے اسے حلال غوامض یونانی کہا ہے اور علومِ حکمیہ میں یکتاء روزگار قرار دیا ہے۔

اکثر مورّخین نے فتح اللہ شیرازی سے منسوب صرف غیر طبّی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تالیفات کے ذیل میں خلاصۃ المنہج، منہج الصادقین، تاریخ اَلفی، رسالۂ عجائباتِ کشمیر، تکملۂ حاشیۂ علامہ دوائی اور اقبال نامۂ اکبری کا ذکر ملتا ہے، لیکن حکیم نیر واسطی لکھتے ہیں کہ فتح اللہ شیرازی کی ایک بہت نادر تالیف ابن سینا کے کلیاتِ قانون کا ترجمہ ہے، جسے فتح اللہ شیرازی نے 1002 ہجری (مطابق 1594ء) میں لاہور میں فارسی زبان میں انجام دیا تھا۔ اس ترجمہ کا ایک خطی نسخہ، جو لکھنؤ میں 1252 ہجری (مطابق 1836ء) کا کتابت شدہ ہے، پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے، محمود نجم آبادی، تہران کی فرمائش پر میں نے اس نسخہ کا عکس لے کر انہیں مرحمت کیا تھا۔

راقم کا خیال ہے کہ یہ وہی ترجمہ ہے جس کا ذکر حکیم سید ظل الرحمٰن اور حکیم الطاف احمد اعظمی نے حکیم فتح اللہ گیلانی کے ذیل میں کیا ہے۔

حکیم نیر واسطی مزید لکھتے ہیں کہ فتح اللہ شیرازی پسر ابو القاسم میر، شاہ فتح اللہ شیرازی کے سواء ایک دوسری شخصیت ہے، جو شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔

شاہ فتح اللہ کے تلامذہ میں حکیم علی گیلانی، میر تقی الدین محمد، شیخ حسن علی موصلی اور ملا عبد السلام لاہوری قابل ذکر ہیں۔ فتح اللہ کے ان تلامذہ نے درس و تدریس کے ذریعہ کثیر تعداد میں شاگرد پیدا کیے، جن کے ذریعہ ہندوستان میں طب و حکمت اور علومِ عقلی کی راہیں ہموار ہوئیں، خصوصاً علومِ عقلی کی اشاعت میں اس کے تلامذہ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستان میں درسِ نظامی کے بانی ملا نظام الدین کے والد ملا قطب الدین بھی اسی سلسلہ کے فیض یافتہ ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں علومِ عقلی کی اشاعت، شاہ فتح اللہ شیرازی کی

مرہونِ منت ہے۔

بدایونی کے مطابق کشمیر سے واپسی کے وقت 997 ہجری (مطابق 1589ء) میں فتح اللہ نے وفات پائی اور جبل سلیمانی پر سپردِ خاک ہوا۔ فتح اللہ کی وفات پر اکبر نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور اس کی ذات کو قیمتی متاع قرار دے کر اس کے سامنے اپنے سارے خزانے کو ہیچ بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اگر فتح اللہ کو فرنگی اسیر بنالیں اور اس کی واپسی کے لیے بطور فدیہ مجھے خزانہ کی ساری چیزیں دینی پڑیں، پھر بھی میں اُنہیں یہ فدیہ دے کر اُسے آزاد کرالوں گا۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ نزہۃ الخواطر جلد 4، عبدالحیٔ حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، 1998ء

2۔ تاریخ روابطِ پزشکی ایران وپاکستان، حکیم نیرواسطی، عکسی اشاعت موسسہ مطالعات تاریخ پزشکی طب اسلامی ومکمل تاریخ اشاعت بہمن ماہ 1382 ہجری شمسی

3۔ منتخب التواریخ، عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، ایران، 1379 ہجری شمسی

4۔ تاریخ طب واطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی ، 1992ء

حکیم عین الملک شیرازی

عین الملک شیرازی، اکبری عہد کا ممتاز طبیب تھا۔ اس کا برادر نسبتی فیضی، اکبر کے معتمدین میں تھا، فیضی سے قرابت داری کے باعث عین الملک بہت جلد بادشاہ کا مقرب بن گیا اوراس کے ساتھ رزم و بزم میں شریک رہنے لگا۔

فنِ طب میں اُسے ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ طبابت، کحالی اور جراحت میں وہ زبردست دستگاہ رکھتا تھا۔ مآثر الامراء، منتخب التواریخ اور طبقاتِ اکبری میں اس کی فنی حذاقت، خصوصاً کحالی میں مہارت کا تذکرہ ملتا ہے۔ عین الملک کو آنکھ کی جراحی میں بڑی مہارت حاصل تھی، اس فن میں وہ یکتا تھا۔ کحالی کے ساتھ وہ معالجات میں بھی درک رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اکبر کے ایک بدخواہ نے قاتلانہ حملہ کیا، تیر بادشاہ کے شانہ میں ایک بالشت تک گھس گیا تھا، عین الملک نے اس زخم کا علاج بڑی خوبی سے کیا اور ایک ہفتہ کے علاج میں ہی آثارِ صحت رونما ہونے لگے۔

عین الملک شیرازی نے طبّی خدمات کے ساتھ ملکی مہمات میں بھی اپنی صلاحیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ اُس عہد کے طبیبوں میں وہ اکبر کی فوجی مہمات میں سب سے زیادہ شریک رہا ہے اور اکبر کے عہدِ حکومت میں اس نے بڑی اہم سفارتی ذمہ داریاں انجام دی ہیں۔ عین الملک کا بیٹا نور الدین محمد عبداللہ بھی طبیب تھا۔ عین الملک نے کئی اہم تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔

تالیفات

1۔ فوائد الانسان:

ادویہ مفردہ واغذیہ پر ایک منظوم رسالہ ہے، اسے عین الملک نے اکبر کی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔ کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے:

''جہاں پناہ نے حکم دیا کہ عرب، ایران، توران، روم اور ہندوستان میں جو چیزیں دواء اور غذاء کے طور پر معروف اور متداول ہیں، انہیں ضبطِ تحریر میں لاؤں۔''

عین الملک نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک کتاب تالیف کرکے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور ان سے اس کا نام تجویز کرنے کی درخواست کی۔ اکبر نے اس کتاب کا نام ''فوائد الانسان'' تجویز کیا۔

کتاب میں شامل دواؤں اور غذاؤں کو حروفِ تہجی کی ترتیب پر بیان کیا گیا ہے۔

2۔ ضیاء العیون:

طب سے متعلق عین الملک کی ایک تالیف 'ضیاء العیون' کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ کتاب امراضِ چشم سے متعلق ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی میں موجود ہے۔

صاحبِ منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی عین الملک کے معاصر ہیں۔ ایک مرتبہ وہ علالت کے باعث تقریباً پانچ ماہ کے لیے لشکرِ سلطانی سے غیر حاضر رہے۔ شفایابی کے بعد جب واپس آئے تو بیماری کا تصدیق نامہ عین الملک سے لکھوایا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانے میں بھی میڈیکل سرٹیفکٹ کا دستور رائج تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں:

''عین الملک، بلند علمی مرتبہ کا حامل اور صاحبِ مکارم اخلاق تھا''۔

طب کے علاوہ عین الملک کو شعر وادب سے بھی دلچسپی تھی 'مثنوی مظہر الاسرار' کے نام سے اس کی ایک تخلیق کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار فوائد الانسان سے بھی ہوتا ہے، جسے عین الملک نے نظم کی شکل میں لکھا ہے۔ اشعار میں دوائی تخلص لکھتا تھا۔ ہنڈیا کے مقام پر 1003 ہجری مطابق 1595ء میں عین الملک نے وفات پائی۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ منتخب التواریخ، عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی، انجمن آثار ومفاخر فرہنگی، ایران، 1379 ہجری شمسی

2۔ اطباءِ عہدِ مغلیہ، حکیم کوثر چاندپوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

3۔ تاریخ طب واطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

4۔ تاریخ روابط پزشکی ایران وپاکستان، حکیم نیرواسطی، موسسہ مطالعاتِ تاریخ پزشکی طبِ اسلامی ومکمل، ایران، بہمن ماہ، 1382 ہجری شمسی

حکیم علی گیلانی

ہندوستان میں یونانی طب کی اشاعت کے حوالہ سے گیلان کے مہاجر طبیبوں کا کردار بے حد اہم ہے۔ مغلیہ عہد میں گیلان سے ہجرت کر کے بکثرت اطباء ہندوستان آئے اور مغل سلاطین کی زرپاشیوں اور فیاضیوں سے شادکام ہوئے۔ ان طبیبوں نے تصنیف و تالیف اور تعلیم کے سلسلہ میں بیش بہا کردار ادا کیا۔ ہندوستان کی طبّی تاریخ میں انہوں نے جو نقوش ثبت کیے وہ نہایت گہرے ہیں۔ ان میں ایک اہم نام حکیم علی گیلانی ہے، وہ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔

اس کے متعلق صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

"علی بن ابوالحکیم گیلانی نے طب کی تعلیم اپنے ماموں حکیم الملک شمس الدین گیلانی اور فتح اللہ شیرازی سے حاصل کی تھی اور دینی تعلیم شیخ عبدالنبی بن احمد گنگوہی سے پائی، گیلانی نہایت اعلیٰ ذہنی صلاحیت کا حامل تھا۔ وہ زبردست تبحر اور استعداد کا مالک تھا، اسے ریاضی اور طب میں دستگاہ اور فنِ تعمیر میں ملکہ حاصل تھا، اس نے ایک عجیب و غریب حوض تعمیر کیا تھا، جس کے نیچے ایک آرام گاہ بنائی تھی، اس میں داخل ہونے کے لیے حوض سے گزرنا ہوتا تھا۔ گیلانی نے حوض کا نقشہ اس طرح ڈیزائن کیا تھا کہ اس کے نیچے مکان میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں داخل ہوتی، مگر روشنی اور ہوا کا معقول انتظام تھا"۔

اکبری دربار سے وابستہ طبیبوں میں عظمت و رفعت کا جو مرتبہ گیلانی کو حاصل تھا، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوسکا۔ حالانکہ اس کے دربار سے بہت سے اطباء وابستہ تھے، مگر شاہی خاندان کے علاج و معالجہ کی ذمہ داری اسی کو تفویض تھی اور بادشاہ کی نگاہ میں اس کی بہت وقعت تھی۔ بادشاہ اس کی

حذاقت کا معترف تھا۔ جب گیلانی پہلی بار دربار میں آیا تو اس کی طبی فراست پرکھنے کی غرض سے بادشاہ کے حکم سے مختلف قارورے پیش کیے گئے، اِن میں تندرست اور مریض کے ساتھ گائے اور گدہے کا بھی قارورہ تھا، گیلانی نے ہر ایک کی صحیح صحیح شناخت کی۔

اکبر کے عہد میں گیلانی کو بڑے اعتبار کا درجہ حاصل تھا، اکبر نے 1580ء میں گیلانی کو عادل شاہ اوّل والیٔ بیجاپور کے پاس بطور سفیر بھیجا تھا، اکبر نے اُسے صوبۂ بہار کا گورنر بھی مقرر کیا تھا۔ منصب کے لحاظ سے اکبر کے دربار میں حکیم علی گیلانی کا مرتبہ سب سے بلند تھا۔

اکبر کی طرح جہانگیر بھی علی گیلانی کی اعلیٰ صلاحیتوں کا معترف تھا۔ جہانگیر نے اس کی خدمت کے صلہ میں دو ہزاری منصب عطا کیا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں 5 محرم 1018 ہجری مطابق 10 اپریل 1609ء کو علی گیلانی نے وفات پائی۔

حکیم علی گیلانی اختراعی ذہن کا مالک تھا۔ روغن دیودار کی ایجاد اس کا بڑا ہی اہم کارنامہ ہے۔ آج تک یہ نسخہ اطباء کے معمولات کا حصہ ہے۔ روغن دیودار کے متعلق گنج بادآورد کے مؤلف کا بیان ہے کہ اکبر کابل جاتے ہوئے راستے میں ہاتھی سے گر گیا، چوٹ کی وجہ سے اس کے اعضاء میں شدید درد ہو رہا تھا۔ حکیم علی گیلانی نے روغن دیودار تیار کر کے مالش کرائی، اس سے اکبر کو بڑا آرام ملا اور صرف تین دن میں اسے افاقہ ہو گیا۔

حکیم علی گیلانی کے تلامذہ میں میر ہاشم اور حکیم صدرا کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

تصانیف

1۔ شرح قانون:

یہ حکیم علی گیلانی کی نہایت مشہور اور معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ دراصل یہی کتاب طبی دنیا میں علی گیلانی کی شہرت کا باعث بنی۔ یہ شرح عربی زبان میں ہے، جسے گیلانی نے اکبری عہد میں تالیف کیا تھا۔ القانون فی الطب کی یہ شرح، شرح گیلانی کے نام سے معروف ہے۔ علاءالدین قرشی کے بعد حکیم علی گیلانی دوسرا شارح ہے، جسے قانون کی مکمل شرح کا افتخار حاصل ہے۔ یہ شرح کلیاتِ آملی کے ساتھ 'جامع الشرحین' کے نام سے 1848ء میں طبع ہوئی ہے۔

گیلانی کی یہ شرح قانون کے مشکل مقامات کی تفہیم کے سلسلہ میں بے حد اہم ہے۔

بعض مقامات پر گیلانی نے ابن سینا کے نظریوں سے اختلاف بھی کیا ہے، مثلاً ابن سینا کے مطابق اخلاط کا اطلاق اُن رطوبات پر ہوتا ہے جو عروقِ دمویہ میں محصور ہیں، لیکن علی گیلانی نے تمام رطوباتِ بدن کو اخلاط میں شمار کیا ہے۔ اس طرح کی چند مثالوں کو چھوڑ کر بیشتر اختلافی مسائل میں اس نے ابن سینا کی وکالت کی ہے، اسی وجہ سے بہت سے تذکرہ نگاروں نے علی گیلانی پر الزام عائد کیا ہے کہ اس نے شرح میں ایک محقق کے بجائے ابن سینا کے وکیل دفاع کا کردار ادا کیا ہے۔

2۔ بیاضِ علی گیلانی:

یہ علی گیلانی کی دوسری اہم کتاب ہے۔ اس میں گیلانی نے اپنے مجربات و معمولات بیان کیے ہیں۔ اسی بیاض میں روغنِ دیودار کے مشہور نسخہ کا بھی ذکر ہے، جسے گیلانی نے عضلات، مفاصل اور اعصاب کے دردوں کو دور کرنے کے لیے اکبر کے لیے تیار کیا تھا۔

یہ بیاض مجربات کے زمرہ کی ایک اہم تالیف ہے۔ اس کے نسخے آصفیہ، حیدرآباد، عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک اور ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ میں موجود ہیں۔

3۔ تاریخ الفی:

یہ تاریخ کے موضوع پر اکبر کے عہد کی تالیف ہے۔ اس کی ترتیب میں سات افراد شامل تھے۔ مرتبین کی ٹیم میں حکیم علی گیلانی بھی تھا۔ بعد میں یہ کام ملا احمد ٹھٹھوی کے سپرد کر دیا گیا۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ نزہۃ الخواطر جلد 5، عبدالحیٔ حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، 1990ء

2۔ اطباءِ عہدِ مغلیہ، حکیم کوثر چاندپوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

3۔ تاریخ طب و اطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

4۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین، حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1986ء

حکیم مظفر بن محمد حسینی شفائیؔ

اکبر کے عہد میں ایران سے ہندوستان آکر یہاں طب کی زمین ہموار کرنے والے طبیبوں میں حکیم مظفر بن محمد حسینی شفائیؔ کی مساعی بے حد اہم ہیں۔

شفائیؔ کا شمار اصفہان کے مشہور اطباء میں تھا۔ وہ ایران کے بادشاہ، شاہ عباس صفوی کے مصاحبین میں تھا۔ شاہ کا رویہ شفائیؔ کے باب میں نہایت عزت و تکریم کا رہا، مگر نا معلوم وجوہ سے وہ اصفہان سے ہجرت کر کے ہندوستان چلا آیا اور یہاں بھی اپنی حذاقت اور فنی کمال کے باعث اعزاز و اکرام حاصل کیا۔

شفائیؔ کے والد حکیم ملاّ بھی اپنے وقت کے حاذق طبیب تھے۔ شفائی نے اصفہان کے علماء سے علومِ عقلی و نقلی کے ساتھ طب و حکمت کی تحصیل کی، طب میں امتیاز پیدا کیا اور طبّی علوم میں بصیرت اور کمال حاصل کیا۔

طب کے ساتھ اسے شعر گوئی میں بھی ملکہ تھا۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھا، مگر ایک عرصہ تک اس کی شاعرانہ صلاحیتیں ہجو کہنے میں ضائع ہوتی رہیں۔ ہجو گوئی کی وجہ سے اس کی علمی شخصیت اور فنی عظمت بھی متاثر ہوئی۔ آخر عمر میں وہ ہجو گوئی سے تائب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے جو اشعار کہے ہیں، ان میں بڑی معنیٰ آفرینی ملتی ہے۔ حکیم مظفر، شفائیؔ تخلص رکھتا تھا اور اسی تخلص سے اسے شہرت ملی۔ شفائیؔ صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ 'دیدۂ بیدار'، 'نمک دانِ حقیقت' اور مثنوی 'مہر و محبت' اس کے شعری مجموعے ہیں۔ ان میں 'نمک دانِ حقیقت' سب سے زیادہ مشہور ہوئی ہے۔

قرابادین شفائی:

حلقۂ طب میں اس کی شہرت کا باعث یہی کتاب ہے۔ یہ قرابادینی ذخیرہ کی ایک اہم

تالیف ہے، اس کا شمار قرابادینی زمرہ کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ میں اس کا ذکر مختلف ناموں سے ہوا ہے۔ مثلاً شفاء العلیل، قرابادین مظفری، طبِ شفائی، شفاء المریض، خلاصۃ الشفاء اور منتخب الطب وغیرہ۔ ناموں کی اس کثرت سے بہت سے مورخین کو دھوکہ ہوا ہے اور وہ ان سب کو علاحدہ کتابیں سمجھ بیٹھے ہیں، حالانکہ یہ سب قرابادین شفائی کے مختلف نام ہیں۔ آخری دو کتابیں خلاصۃ الشفاء اور منتخب الطب دراصل اسی کتاب کا خلاصہ اور انتخاب ہیں۔

قرابادین شفائی رشفاء العلیل فارسی زبان میں ہے۔ یہ ہندوستان میں مختلف مطابع سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ پہلی بار 1851ء میں محمد حسین کے زیر اہتمام مطبع دہلی اخبار سے شائع ہوئی تھی۔ حکیم ہادی حسین مرادآبادی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ 1299 ہجری (مطابق 1882ء) میں مطبع نامی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

شفائی کی یہ قرابادین طبی حلقہ میں بطور حوالہ استعمال ہوتی ہے۔ اس میں مرکبات کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔

اسٹوری نے 'بست باب فی الطب' کے نام سے شفائی کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔

کلیاتِ شفائی کے نام سے ایک کتاب حکیم مظفر بن محمد حسینی شفائی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کا ایک نسخہ سالار جنگ، حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ حکیم سید ظل الرحمٰن نے اس کلیات کے شفائی کے نام سے انتساب کو محل نظر قرار دیا ہے۔

1037 ہجری (مطابق 1627ء) میں شفائی کا انتقال ہوا۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ اطباء عہد مغلیہ، حکیم کوثر چاندپوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

2۔ تاریخ طب و اطباء دور مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

3۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین، حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1986ء

حکیم فتح اللہ گیلانی

حکیم فتح اللہ گیلانی، عہدِ اکبری کے نامور طبیب، حکیم ابوالفتح کا بیٹا تھا۔ ملاّ عبدالقادر بدایونی نے اکبری عہد کے طبیبوں کے ذیل میں ان باپ بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔

ملاّ عبدالقادر بدایونی، حکیم فتح اللہ گیلانی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ طب کے سلسلہ میں اس کا مطالعہ نہایت وسیع تھا اور علمِ ہیئت کی بھی اسے خاطر خواہ آگہی تھی۔ اس کے باپ حکیم ابوالفتح کے متعلق بدایونی نے لکھا ہے:

> ''وہ بادشاہ کا نہایت مقرب اور اس کے مزاج میں دخیل تھا۔ بادشاہ سے اس کی غایت درجہ قربت نے دربار کے دوسرے متعلقین کی نگاہوں میں اسے محسود بنا دیا تھا۔ وہ نہایت عمدہ ذہن اور جودتِ طبع کا مالک تھا اور نظم و نثر میں اسے امتیاز حاصل تھا، اسی کے ساتھ اس کی بے دینی اور بد اخلاقی بھی ضرب المثل تھی''۔

قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین میں فتح اللہ گیلانی کے باپ کا نام فخر الدین شیرازی لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں حکیم الطاف احمد اعظمی لکھتے ہیں کہ بہت سے اہل علم نے فتح اللہ گیلانی اور فتح اللہ شیرازی کے بیان میں خلط ملط کیا ہے اور فتح اللہ کو فخر الدین شیرازی کا بیٹا بتایا ہے۔ حالانکہ شیرازی کا بیٹا گیلانی کیسے ہوسکتا ہے۔

بدایونی لکھتا ہے کہ حکیم فتح اللہ گیلانی نے فارسی میں قانون کی شرح لکھی ہے، جس وقت بدایونی فتح اللہ گیلانی کا تذکرہ لکھ رہا تھا، اس وقت گیلانی قلیچ خاں کے معالجہ کے سلسلہ میں کابل گیا ہوا تھا۔ قلیچ خاں اکبر کے اہل کاروں میں تھا اور پنج ہزاری منصب پر فائز تھا۔ ان دنوں وہ

کابل میں مامور تھا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گیلانی کو علاج و معالجہ میں کمال حاصل تھا اور اس سلسلہ میں اس کے پاس دور دراز سے بلاوے آتے تھے۔

حکیم فتح اللہ جہاں گیر کے عہد میں بھی تھا۔ بادشاہ کی طرف سے اُسے یک ہزار ذات دوی صد سوار کا منصب ملا ہوا تھا، لیکن سلطان خسرو کی بغاوت کے دوران بادشاہ سے اس کی وفاداری مشکوک ہوگئی اور بادشاہ کے خلاف سازش کے جرم میں اسے گدھے پر بیٹھا کر گھمایا گیا، پھر اندھا کر دیا گیا۔ جب ہندوستان میں اس کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہوگیا تو وہ اپنے وطن گیلان چلا گیا اور وہاں اس نے خودکشی کر لی۔

حکیم فتح اللہ کا مطب و معالجہ کے علاوہ قرطاس و قلم سے بھی تعلق تھا۔ کلیاتِ قانون کا فارسی ترجمہ اس کی قلمی یادگار ہے۔ بدایونی نے جس شرح قانون کا ذکر کیا ہے، وہ دراصل یہی ترجمہ ہے، جسے فتح اللہ نے 1002 ہجری مطابق 1593ء میں انجام دیا تھا۔ یہ ترجمہ مطبع منشی نول کشور سے 1890ء میں طبع ہوا ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ منتخب التواریخ، عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی، انجمن آثار مفاخر فرہنگی، ایران، 1379 ہجری شمسی

2۔ تاریخ طب و اطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

3۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین، حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1986ء

حکیم دوائی گیلانی

حکیم دوائی گیلانی کا نام عبداللہ اور دوائی تخلص تھا۔ گیلان کے علاقہ لاہیجان کا باشندہ تھا۔ شاہ جہاں کی شاہزادگی کے زمانے میں ہندوستان آیا، اسے شاہ جہاں کا استاذ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر ہفت اقلیم کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ مرزا عزیز سے دوائی کے دوستانہ مراسم تھے، اس کے اصرار پر دوائی ہندوستان آیا اور دربار اکبری سے منسلک ہو کر اپنے فضل وکمال کے باعث عزت وشہرت حاصل کی۔

تالیفات

خلاصۃ الطب:

یہ حکیم دوائی لاہیجی کی معالجات کے موضوع پر ایک اہم تالیف ہے۔ اس کا ایک مکمل قلمی نسخہ جامعہ ہمدرد دہلی کی میڈیکل لائبریری میں موجود ہے۔ یہ نسخہ 1660ء کا مکتوبہ ہے اور 710 صفحات پر مشتمل ہے۔

خلاصۃ الطب 1591ء کی تالیف ہے۔ یہ دراصل موجز القانون (تلخیص قانون ابن سینا) کی فارسی شرح ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کو چار فنون میں تقسیم کیا ہے۔

1۔ فن اوّل میں طب کے علمی مباحث اور عملی اصول وضوابط کا بیان ہے۔

2۔ فن دوم علم الادویہ کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس میں مفرد و مرکب دواؤں اور غذاؤں کا تذکرہ ہے۔

3۔ فن سوم میں امراضِ غیر مخصوصہ کی تفصیلات مثلاً ان کے اسباب، علامات اور علاج

وغیرہ کا ذکر ہے۔

4۔ فن چہارم میں امراضِ مخصوصہ کے اسباب، علامات اور علاج تحریر کیے گئے ہیں۔

مطالعاتی ماٰخذ

1۔ نزہۃ الخواطر جلد 5، عبدالحیٔ حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدر آباد، 1990ء

2۔ تاریخ طب واطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

3۔ تاریخ روابطِ پزشکی ایران وپاکستان، حکیم نیرواسطی، عکسی اشاعت موسسہ مطالعات تاریخ پزشکی طب اسلامی ومکمل، ایران، بہمن ماہ، 1382 ہجری شمسی

4۔ اطباءِ عہدِ مغلیہ، حکیم کوثر چاندپوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

5۔ طب اسلامی برصغیر میں، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1988ء

حکیم صدرا

حکیم صدرا ایک قدیم طبی سلسلہ کا فرد ہے۔ اس کے خاندان میں طب اور طبابت سے وابستگی کی قدیم تاریخ ملتی ہے۔ حکیم حارث بن کلدہ جو عہدِ نبوت میں ایک تعلیم یافتہ طبیب کی حیثیت سے معروف تھے، اُن سے صدرا کا نسبی سلسلہ ملتا ہے۔

حکیم صدرا کے والد حکیم فخر الدین شیرازی ایران میں اپنے عہد کے نہایت گرامی منزلت طبیب تھے، اُن سے شاگردی کی نسبت کو باعثِ فخر تصور کیا جاتا تھا۔ حکیم صدرا نے طب کی تعلیم اپنے فاضل والد اور حکیم عماد الدین محمود شیرازی کے بیٹے حکیم باقر سے حاصل کی۔ 1011 ہجری مطابق 1603ء میں ہندوستان آنے کے بعد اس نے حکیم علی گیلانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ حکیم صدرا نے اپنے زمانہ کے نامور اساتذہ سے طب کی تعلیم حاصل کر کے اس فن سے وابستگی کی خاندانی روایت کو آگے بڑھایا اور اس میدان میں شہرت اور ناموری حاصل کی۔

فن طب میں کمال کے باعث جہاں گیر کے عہدِ حکومت میں صدرا نے کافی عزت و شہرت حاصل کی۔ جہانگیر نے علی گیلانی کی وفات کے بعد صدرا کو پانچ صدی منصب اور مسیح الزماں کا خطاب عطا کیا، جہانگیر کے عہد میں صدرا نے تین ہزاری منصب حاصل کر لیا تھا۔

جہانگیر کے بعد جب شاہ جہاں تخت نشین ہوا تو اس نے بھی صدرا کے ساتھ عنایات کا سلسلہ جاری رکھا۔ صدرا، شاہ جہاں کا نہایت مقرب اور معتمد تھا، بادشاہ سے اس کی قربت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں صدرا عہدِ مکرر کے منصب پر فائز ہو گیا۔ اس منصب پر وہی لوگ مامور کیے جاتے، جو نہایت معتبر اور بادشاہ کے مزاج آشنا ہوتے تھے۔

صدرا کی طبی حذاقت اور فنی مہارت کے تعلق سے یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب

اٹھارہویں جلوس شاہ جہانی میں جہاں آرا بری طرح جل گئی تھی، اس آتش زدگی کا علاج صدرا نے بڑی مہارت سے کیا تھا، شاہ جہاں نے اس خدمت سے خوش ہو کر دس ہزار روپے بطور انعام عطا کیے اور اس کے شاہی وظیفہ کی رقم میں دس ہزار کا اضافہ کر کے پچاس ہزار روپے سالانہ کر دیا۔

صدرا کو طب کے ساتھ علوم حکمیہ میں بھی مہارت حاصل تھی، اس سلسلہ میں شرح ہدایت الحکمت اس کی مشہور تصنیف ہے۔ اس کتاب پر ملا نظام الدین خلف ملا قطب الدین نے حاشیہ لکھا تھا۔

طب وحکمت کے علاوہ شعر وادب سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ شعر گوئی میں ممتاز تھا، مسیح اللّٰہی تخلص کرتا تھا۔

'حفظِ صحت' کے نام سے صدرا نے ایک طبی تالیف یادگار چھوڑی ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، جو اورنگ زیب کے نام معنون ہے۔

آخر عمر میں صدرا ملازمت سے مستعفی ہو کر لاہور میں مقیم ہو گیا اور نہایت عیش وآرام کی زندگی بسر کرتا رہا۔ گرمیوں میں کشمیر چلا جاتا تھا۔ 1061 ہجری مطابق 1651ء میں کشمیر میں اُس نے وفات پائی۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ اطباءِ عہدِ مغلیہ، حکیم کوثر چاند پوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

2۔ تاریخ طب واطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

3۔ دلّی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی، دہلی، اشاعتِ ثانی 2011ء

حکیم امان اللہ خاں

حکیم امان اللہ خاں، مغلیہ دور کے طبیبوں میں بڑی ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اس کی شخصیت متنوع کمالات سے متصف تھی۔ اس کی ذات میں اتنے اوصاف جمع ہو گئے تھے کہ وہ اپنے عہد کی ایک ہمہ گیر شخصیت بن گیا تھا۔

امان اللہ نام اور خان زماں فیروز جنگ خطاب تھا، اس کے والد مہابت خاں، شاہ جہاں کی فوج میں سپہ سالار تھے، خود امان اللہ خاں، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں معزز عہدوں پر فائز رہا ہے۔ کچھ دنوں کابل میں نائب امیر (گورنر) بھی رہا۔ شاہ جہاں نے اسے پنج ہزاری منصب اور خان زماں کا خطاب عطا کیا تھا۔ بالارکھاٹ میں 1636ء میں اس نے وفات پائی۔ کسی ایک فرد میں سیف وقلم کے اجتماع کی حکیم امان اللہ خاں مثال تھا۔ علمی لحاظ سے اس کی شخصیت بے حد متنوع تھی۔ وہ ایک حاذق طبیب ہونے کے ساتھ بلند پایہ عالم، ادیب، عظیم شاعر، فرہنگ نگار اور معتبر مورخ تھا۔ امانی تخلص تھا۔ فارسی میں نظم ونثر کے نہایت اعلیٰ نمونے یادگار چھوڑے ہیں۔ چھوٹی بڑی تقریباً بارہ کتابیں اس کے علمی ذوق اور ہمہ جہت شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔

تصانیف

1۔ گنج بادآورد:

یہ قرابادینی ذخیرہ کی مہتم بالشان کتاب ہے۔ اس کا دوسرا نام 'گنج بادآورد صاحبقرانی' بھی ہے۔ اسے 'قرابادینِ خان زمانی' اور 'قرابادینِ داراشکوہی' کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ اس کتاب میں مرکب ادویہ کی تفصیل کے ساتھ علم الامراض، معالجات، کلیات اور سریری تجربات کا بھی احاطہ ہے۔ اس کی جامعیت کی وجہ سے مؤلف نے اسے '

گنج بادآورد' کے نام سے موسوم کیا ہے، جو قیصر روم کے خزانہ کی طرف اشارہ ہے۔
'گنج بادآورد' کی علمی وفنی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے مشہور مورخ اُوپی جگی لکھتا ہے:

''عہد مغلیہ کا یہ فارما کو پیائی دائرۃ المعارف، حکیم امان اللہ خاں نے 1638ء میں شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں مدون کیا۔ یہ انسائیکلو پیڈیا ادویاتی تعلیم، اعمالِ ادویہ، نیز یونانی معالجین اور ہندوستان کے آیورویدک اطباء کے تجربات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مختلف ادویہ کے استعمال، نیز ان کے مرکبات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، جس میں ان کے کیمیاوی خواص اور مختلف امراض میں ان کے استعمال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں نہ صرف تاریخی اور آزمودہ نسخوں کا ذخیرہ موجود ہے، بلکہ خود مصنف کے مجربات بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کے مؤلف نے اس مجموعہ کی تالیف میں کم وبیش 105 عربی، فارسی اور سنسکرت کتابوں سے استفادہ کیا ہے''۔

پوری کتاب من حیث المجموع تین حصوں پر مشتمل ہے، تمہیدی حصہ کو مفتاح کے نام سے موسوم کیا ہے، جو کہ سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ مفتاح کے بعد تین گنجور ہیں۔
پہلے گنجور میں ادویہ مفردہ ومرکبہ کا بیان ہے۔ یہ گنجور آٹھ نقد پر مشتمل ہے۔
دوسرا گنجور آٹھ عقد پر مشتمل ہے۔ اس میں تریاقات، افیون کے مرکبات، معاجین، مفرحات، حبوبات، لعوقات، اقراص، سفوفات، اشربہ، سکنجبین، روغنیات، عرقیات اور دیگر مرکبات کا بیان ہے، نیز بعض ہندی جڑی بوٹیوں کے افعال وخواص، ہندی اطباء کے مستعمل مرکبات، سمیات اور ان کے استعمال کا تذکرہ ہے۔
تیسرے گنجور میں عطریات، اغذیہ، اچار اور نمک وغیرہ کا بیان ہے۔ کتاب کا آخری حصہ طلسم کے نام سے موسوم ہے۔ طلسم کو اٹھارہ اعمال میں منقسم کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف اعمال وصنائع بیان کیے گئے ہیں۔
اس کتاب کا مکمل نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے۔ مخطوطہ کی شکل میں ہونے کی وجہ سے اہل فن کی دسترس سے دور ہے۔ اس کی تدوین اور ترجمہ کی اشد ضرورت ہے۔

2۔ دستور الہند:

یہ درحقیقت سنسکرت کتاب مدن ونود (Madan Vinod) کا فارسی ترجمہ ہے، جسے حکیم امان اللہ خاں نے 1635ھ میں انجام دیا تھا۔ کتاب کے مقدمہ میں آیورویدک اصول، تری دوشا وغیرہ اور دیگر تفصیلات سے بحث کی گئی ہے۔ مقدمہ میں مصنف نے یہ وضاحت کی ہے کہ ہر ملک میں پیدا ہونے والی دوائیں وہاں کے امراض اور وہاں کے باشندوں کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں، لہٰذا اُن کے افعال کا علم حاصل کرنے کے لیے وہاں کی زبان اور مصطلحات کا علم ضروی ہے، اسی غرض سے میں نے ہندی اطباء کی زبان اور اصطلاحات کا علم حاصل کیا۔

یہ کتاب مقدمہ کے علاوہ تین ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں مفرد ادویہ کے افعال وخواص کو حروف تہجی کی ترتیب پر بیان کیا گیا ہے۔ بیان کردہ کل دواؤں کی تعداد 586 ہے۔ دوسرے باب میں اغذیہ واشربہ اور تیسرے باب میں مرکبات کا بیان ہے۔ دونوں ابواب میں تقریباً 700 ہندی ادویہ مفردہ واغذیہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے خطی نسخے پٹنہ، حیدرآباد، علی گڑھ اور دہلی میں موجود ہیں۔

3۔ مفتاح الحدود:

یہ 53 اوراق پر مشتمل مختصر رسالہ ہے۔ اسے مصنف نے اپنے والد مہابت خاں کے نام معنون کیا ہے۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں اس کا خطی نسخہ موجود ہے۔

4۔ اُم العلاج:

اس کا سنہ تالیف 1063ھ مطابق 1653ء ہے۔ اسے شہنشاہ جہانگیر سے منسوب کیا گیا ہے یہ فارسی زبان میں 68 صفحے کا مختصر رسالہ ہے، جو ایک مقدمہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں منضجاتِ اخلاط اور اسہال کے اصول وقوانین بیان کیے گئے ہیں۔ یہ 1880ء میں مطبع منشی نول کشور کان پور سے شائع ہوا ہے۔

5۔ اشراحِ کاملہ خان زمانی

6۔ رسالہ در طریقۂ مسہلات

7۔ مقدمۂ مرأة الجواہر

8۔ تاریخِ سلاطین عالم

9۔ رقعاتِ امان اللہ حسینی:

یہ ہم عصر صوفیاء کے نام خطوط کا مجموعہ ہے، جن میں تصوف اور عرفان کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ مجموعۂ خطوط مصنف کی ادبی شان اور صوفیانہ جہت کا مظہر ہے۔

10۔ انشاء خانہ زاد خاں:

یہ خطوط کا دوسرا مجموعہ ہے، اس میں سیاسی اور ملکی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

11۔ دیوان امانی:

یہ نظموں کا مجموعہ ہے، اس میں بہت سی نظمیں شاہ جہاں کی مدح میں ہیں۔

12۔ چہار عنصر دانش:

یہ کتاب امان اللہ خاں کی فرہنگ دانی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یہ عربی فارسی کی اچھی ڈکشنری ہے، جس میں طبّی مصطلحات بھی موجود ہیں۔

اس کتاب کی تمہید میں مصنف نے جہانگیر کے نظمِ حکومت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ علم وفن کی ترویج واشاعت کا کس قدر خواہش مند تھا۔

مذکورہ بالا سطور میں بیان کردہ تالیفات، مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ امان اللہ خاں کی ان متنوع تصنیفات وتالیفات اور تراجم سے اس کی علمی ہمہ جہتی کا اظہار ہوتا ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ جہانِ طب، جلد 7، شمارہ 2، اکتوبر۔ دسمبر 2005ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

2۔ جہانِ طب، جلد 8، شمارہ 4، اپریل۔ جون 2007ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

3۔ تاریخ طب واطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

4۔ دلّی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی، دہلی، اشاعت ثانی 2011ء

حکیم معصوم خاں

شیراز سے ہندوستان آنے والے طبیبوں میں ایک اہم نام حکیم معصوم خاں ہے۔ وہ شیراز میں پیدا ہوا اور وہیں طب اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ وہ صاحبِ علم اور صاحبِ نظر طبیب تھا۔ اس کی طبی فراست کا ایک واقعہ ہے کہ اس نے شہزادہ محمد اعظم کو آگاہ کیا تھا کہ اس کے اندر سوء القنیہ کی علامات موجود ہیں، اگر مناسب علاج اور پرہیز نہ کیا تو یہ عارضہ مستقبل میں استسقاء کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ شہزادہ نے اس کے مشورہ پر توجہ نہیں دی اور معصوم خاں کے انتقال کے بعد اس کی پیشین گوئی کے مطابق شہزادہ استسقاء میں مبتلا ہوا۔

تالیف

قرابادین معصومی:

حکیم معصوم خاں کی ایک اہم تالیف ہے اور طبی دنیا میں اس کی شہرت کا باعث یہی قرابادین ہے۔ صاحبِ نزہۃ الخواطر نے 'محبوب الالباب' کے حوالہ سے اس کا سنہ تالیف 1050 ہجری (مطابق 1640ء) لکھا ہے۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں اس کے چار نسخے موجود ہیں، ایک نسخہ کے دیباچہ میں قرابادین کا سال تکمیل 1059 ہجری مطابق 1649ء لکھا ہے۔ یہ نسخہ 1358 اوراق پر مشتمل ہے۔ سطور 15، کتابت معمولی نستعلیق میں ہے۔ عنوان منقش ہے، کتابت 1114 ہجری (مطابق 1702ء) کی ہے۔

قرابادین معصومی کا ایک نسخہ ابن سینا اکاڈمی، علی گڑھ میں موجود ہے۔ یہ 208 صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ پر 24 سطریں ہیں۔ خط، نستعلیق مائل بہ شکستہ ہے۔ اس نسخہ میں بھی قرابادین کا سال تکمیل 1059 مرقوم ہے۔

یہ قرابادین مقدمہ اور خاتمہ کے علاوہ سات مقالوں پر منقسم ہے۔اس کا مقدمہ 12 فائدوں پر محیط ہے، جس میں مؤلف نے مختلف ضابطوں مثلاً ترکیبِ ادویہ کی کیفیت، غسل حجریات اور احراقِ ادویہ وغیرہ سے بحث کی ہے۔

اس قرابادین کی ترتیب روایتی طرز، حروف تہجی کے لحاظ سے نہیں ہے۔اس کے مشتملات حسب ذیل ہیں:

مقالہ اول کا پہلا باب تریاقات، دوسرا باب مفرحات، تیسرا باب معاجین، چوتھا باب جوارشات، پانچواں باب اطریفلات اور چھٹا باب ایارجات کے بیان میں ہے۔

مقالہ دوم میں شربت، لعوق، مربیٰ، رب، سکنجبین، حلویٰ، سفوف کا بیان ہے۔

مقالہ سوم میں حب، بندق، قرص، ذرور، سنون، نفوخ، بخور، شموم کا تذکرہ ہے۔

مقالہ چہارم ماء الحیات، جوشاندہ، خیساندہ، نطول، غرغرہ، قطور، سعوط اور حقنہ کے بیان پر مشتمل ہے۔

مقالہ پنجم میں ضماد، طلاء، خضاب، دہن، مرہم، فرزجہ کا بیان ہے۔

مقالہ ششم مقیات، انواعِ حقنہ اور شیاف وغیرہ کے بیان پر مشتمل ہے۔

مقالہ ہفتم میں ادویۂ عین کا تذکرہ ہے۔

خاتمہ میں فادزہر پر گفتگو کی گئی ہے۔

قرابادینِ معصومی کے بارے میں مؤلف کا بیان ہے کہ کتبِ متداولہ میں مذکور مرکبات اور اطباءِ متقدمین کے مجربات کے علاوہ اس میں ایسے مرکبات بھی شامل ہیں جن کا ذکر متقدمین کے یہاں نہیں ملتا، بلکہ یہ متاخرین کی ایجاد ہیں۔یہ ہندوستانی طبیبوں کے آزمودہ ہیں اور ان کے تجربات نے ان کی افادیت کی توثیق کی ہے۔

حکیم معصوم خاں کی یہ تالیف طب کے قرابادینی ذخیرہ کی خاص کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ہندوستان کے تناظر میں اس کا ایک اہم اِفادی پہلو یہ ہے کہ یہ محض علمی نوعیت کی کتاب نہیں، بلکہ اس میں ہندوستانی طبیبوں کے معمولات و مجربات شامل ہیں۔اس لیے یہ مطب ومعالجہ میں برتنے کا ایک عمدہ سامان ہے۔

قرابادینِ معصومی کا مدونہ متن کتب خانہ وادارۂ تحقیق مخطوطاتِ مشرقی، آندھرا پردیش کے ذریعہ 2013ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کی تدوین ڈاکٹر اشفاق احمد نے کی ہے، وہ اس کے اردو ترجمہ پر بھی کام کر رہے ہیں۔ قرابادینِ معصومی کی تدوین میں ڈاکٹر اشفاق احمد کے پیشِ نظر سالار جنگ میوزیم حیدرآباد، گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج حیدرآباد، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین میڈکل ہیریٹج حیدآباد کے علاوہ دو خطی نسخے گورنمنٹ اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کے رہے ہیں۔ نیشنل مینواسکرپٹ مشن، دہلی کے ایک منصوبہ کے تحت بھی قرابادینِ معصومی کی تدوین کی گئی ہے۔ اسے حکیم عبدالباری نے انجام دیا ہے۔ یہ متن 2017ء میں شائع ہوا ہے۔

حکیم معصوم خاں، شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا تھا اور 1102 ہجری مطابق 1690ء میں فوت ہوا۔

مطالعاتی ماخذ

1۔ نزہۃ الخواطر جلد 5، عبدالحیٔ حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، 1990ء

2۔ طب اسلامی برصغیر میں، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1988ء

3۔ تاریخ طب واطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

4۔ دلّی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی، دہلی، اشاعت ثانی 2011ء

5۔ فہرست میکروفلم نسخہ ہای خطی فارسی وعربی (جلد سوم) کتاب خانہ حکیم سید ظل الرحمان، مرکز میکروفلم نور، ایران، ہند، 2001ء

حکیم نورالدین محمد عبداللہ

حکیم نورالدین مغلیہ عہد کا ایک نامور طبیب تھا، اس کے والد عین الملک شیرازی کا شمار عہد اکبری کے ممتاز طبیبوں میں ہوتا ہے۔ حکیم نورالدین آگرہ میں پیدا ہوا۔ شعروادب اور تصوف سے دلچسپی کے ساتھ اسے بہت سے علوم وفنون میں دستگاہ حاصل تھی۔ طب کے میدان میں اسے امام کا مرتبہ حاصل تھا۔ شاہ جہاں کے دور میں جن طبیبوں نے شہرت حاصل کی، ان میں نورالدین کا درجہ علم وفضل کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔ اس کے علمی تبحر اور فنی حذاقت سے متاثر ہو کر شاہ جہاں نے 'عین الملک' کا خطاب عطا کیا تھا۔

نورالدین کا شمار مغلیہ عہد کے صاحبِ تصنیف اطباء میں ہوتا ہے۔ طبی حلقہ میں اس کی تصنیفات کو اعتبار اور مرجعیت کا درجہ حاصل ہے۔ طب کے علاوہ تصوف اور دیگر موضوعات پر بھی اس نے کئی اہم تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ مثلاً مراتب الوجود، واقعاتِ ابوالفضل، لطیفۂ فیضی اور انشاء عیار دانش وغیرہ۔

حکیم نورالدین نے طب کے مختلف موضوعات مثلاً معالجات، ادویہ، حفظانِ صحت اور لغت پر جو کتابیں تالیف کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

1- جامع الاطباء:

یہ کتاب علم الادویہ سے متعلق ہے۔ اس کا دوسرا نام 'الفاظ الادویہ' ہے، بعض مؤرخین نے 'جامع الاطباء' اور 'الفاظ الادویہ' کو دو علاحدہ کتابوں کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں حروف تہجی کی ترتیب پر مفرد اور مرکب دوائیں بیان کی گئی ہیں۔ اس میں ہر دوا کا تلفظ لکھنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نورالدین نے بعض

ایسی دواؤں کو بھی بیان کیا ہے، جن کا ذکر مفردات کی کم کتابوں میں ملتا ہے۔

اس کا سنہ تالیف 1038 ہجری مطابق 1628ء ہے۔ یہ شاہ جہاں کے نام معنون ہے۔ اس کا شمار یونانی طب کی مشہور کتابوں میں ہوتا ہے۔ لاہور، مدراس، کلکتہ، لکھنؤ اور دہلی کے مطابع سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ گلاڈون نے اس کتاب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ اصل متن کے ساتھ 1793ء میں کلکتہ سے شائع ہوا ہے۔

2۔ انیس المعالجین:

یہ ایک اہم طبی تالیف ہے۔ دوسرے مطابع کے علاوہ صرف مطبع منشی نول کشور، کانپور سے تین بار شائع ہو چکی ہے۔

3۔ طبِ داراشکوہی:

اسے نور الدین نے داراشکوہ کے لیے تالیف کیا تھا۔ اس کا دوسرا نام 'علاج داراشکوہی' ہے۔ یہ معالجات کے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔ اس کا سنہ تالیف 1050 ہجری مطابق 1640ء ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قدیم یونانی حکماء مثلاً بقراط، جالینوس کے ساتھ عربی اور ایرانی عہد کے مشہور اطباء مثلاً رازی، ابن سینا، سمرقندی، عماد الدین محمود شیرازی وغیرہ کے مجربات نقل کرنے کے علاوہ مصنف نے ویدوں کے تجربات بھی بیان کیے ہیں۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصۂ اوّل میں حفظانِ صحت کی تدابیر بیان کی گئی ہیں اور حصۂ دوم میں تشریح اور فصد جیسے اُمور کے ساتھ امراض اور ان کے علاج کا بیان ہے اور جراحیات کا بھی مختصر تذکرہ ہے۔ اس کتاب سے مغلیہ عہد کے طبیبوں کے طریقۂ مطب، جہتِ مطب اور فنِ نسخہ نویسی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

4۔ قسطاس الاطباء:

یہ عربی و فارسی طبی اصطلاحات کا لغت ہے۔ اس کا سنہ تالیف 1050 ہجری مطابق 1640ء ہے۔ مؤلف نے اس لغت کو حکیم امان اللہ خان زماں فیروز جنگ کے نام

معنون کیا ہے۔ قسطاس الاطباء کے خطی نسخے ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔

5۔ سبب ستہ رشیدیہ:

یہ کتاب حفظانِ صحت کے موضوع پر ہے، اس میں اسباب ستہ ضروریہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

حکیم نورالدین کا بیٹا شمس الدین بھی طبیب تھا اور نور جہاں کے والد اعتماد الدولہ مرزا غیاث بیگ کا طبیب خاص تھا، طب غیاثیہ اس کی ایک اہم تالیف ہے۔

حکیم نورالدین نے 1646ء اور 1648ء کے درمیان وفات پائی۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان، حکیم نیر واسطی، عکسی اشاعت موسسہ مطالعات تاریخ پزشکی طب اسلامی و مکمل، ایران، تاریخ اشاعت بہمن ماہ 1382 ہجری شمسی

2۔ تاریخ طب واطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

3۔ دلّی اور طبِ یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی دہلی، اشاعت ثانی، 2011ء

حکیم علوی خاں

اصل نام محمد ہاشم تھا، مگر طبی دنیا میں علوی خاں کے لقب سے مشہور ہیں۔ والد کا نام حکیم محمد ہادی اور دادا کا نام سید مظفر الدین تھا۔ حکیم علوی خاں 1080ھ/1669ء میں شیراز میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔

1111ھ/1699ء میں شیراز سے ہجرت کر کے دہلی آئے، یہ زمانہ شہنشاہ اورنگ زیب کی حکومت کا تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ محمد شاہ نے انہیں چھے ہزاری منصب اور معتمد الملوک کا خطاب عطا کیا۔

مغلیہ دور کے طبیبوں میں حکیم علوی خاں نہایت اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے یونانی طب کو علمی اور عملی دونوں اعتبار سے بلندی عطا کی ہے۔ اس عہد کے مورخین نے علوی خاں کی طبی مہارت اور معالجانہ حذاقت کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں۔ محمد شاہ کو حکیم علوی خاں کی فنی مہارت پر حد درجہ اعتماد تھا اور وہ ان کی رائے کو بہت اہمیت دیتا تھا۔

علوی خاں سے پہلے دہلی میں کسی طبیب کو وہ عظمت و شہرت نصیب نہیں ہوئی، جو اُن کے حصہ میں آئی۔ وہ محض امراء اور سلاطین کے معالج نہیں تھے، دہلی اور دہلی کے باہر ہزاروں باشندوں نے ان سے فیض پایا۔ ان کے درس کی وسعت کا یہ عالم رہا ہے کہ ہندوستان کے بیشتر گرامی منزلت طبیبوں کا سلسلہ ان پر منتہی ہوتا ہے۔ بے شمار طلبہ نے ان سے استفادہ کیا۔ دہلی میں ان کے درس اور مطب کی دھوم تھی۔ دور دور سے طلبہ ان کی خدمت میں پہنچتے تھے۔ انہیں دہلی میں ایک مستقل اسکول کا درجہ حاصل تھا۔ ان کے سلسلہ کے طبیب علوی خانی کہلاتے ہیں۔ ہندوستان کی طبی تاریخ بنانے میں جن اطباء کا بہت زیادہ حصہ ہے، ان میں علوی خاں کا نام سرفہرست ہے۔

حکیم علوی خاں نے مطب و معالجہ، درس و تدریس اور شاہی ملازمت کے ساتھ مختلف طبی موضوعات پر کئی اہم تالیفات یادگار چھوڑی ہیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

تصانیف

حکیم علوی خاں کثیر التصانیف اور مستند مصنف تھے۔ ان کا طبی ورثہ تین اقسام پر محیط ہے:

1۔ ذاتی تصانیف

2۔ افادات: جو ان کے شاگردوں نے قلم بند کیے۔

3۔ بعض نایاب و نادر کتابیں جو انہوں نے اپنے قلم سے نقل کیں اور ان میں سے بعض ابھی تک محفوظ ہیں۔

چونکہ حکیم علوی خاں اپنی شخصیت کے اعتبار سے سند کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اس لیے ان کی تصانیف کے ساتھ دو طرح کے سانحے پیش آئے۔ ان کی بعض تصانیف کو کچھ دوسرے لوگوں نے اپنے نام سے منسوب کر لیا اور بعض اداروں نے دوسروں کی کچھ تصانیف، علوی خاں کے نام سے چھاپ دیں۔

حکیم علوی خاں کی چند اہم تصانیف درج ذیل ہیں:

1۔ جامع الجوامع محمد شاہی:

یہ حکیم علوی خاں کی ایک اہم تالیف ہے۔ ولیم ٹامس کا اس کے بارے میں خیال ہے کہ اگر تمام طبی کتب ضائع کر دی جائیں تو 'جامع الجوامع' سے طبی مسائل دوبارہ مستنبط کیے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں دو مغالطے بہت عام ہیں۔ ایک یہ کہ صرف اسے قرابادین کی کتاب سمجھا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ کچھ لوگ اسے حکیم محمد حسین خاں کی 'مجمع الجوامع' کا دوسرا نام سمجھتے ہیں۔

'جامع الجوامع' میں قرابادین کے علاوہ طب کے دوسرے مباحث بھی شامل ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

حصۂ اوّل : طب یونانی کے مبادیات

حصۂ دوم : ادویۂ مفردہ

حصہ سوم : ادویہ مرکبہ

حصہ چہارم: امراضِ عامہ

2۔ قرابادینِ علوی خاں:

علوی خاں کی اہم تالیف ہے۔ یہ ہندوستانی اطباء کے معمولات میں شامل رہی ہے۔

3۔ کتاب النبات:

اس کتاب میں سیاروں کی تاثیرات کے حوالہ سے ادویہ کا بیان ہے۔

4۔ احوالِ اعضاءِ نفس:

اس میں امراض کی تشخیص اور علاج کا تذکرہ ہے۔

5۔ شرح موجز القانون:

یہ فارسی زبان میں موجز القانون کی شرح ہے۔92 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 1883ء میں مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوئی ہے۔ یہ سترہ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں معالجاتی قوانین کا اختصار کے ساتھ تذکرہ ہے۔

6۔ تذکرۃ العلاج:

یہ کتاب 668 صفحات پر مشتمل ہے، اس کا ایک نادر مخطوطہ دیوبند میں محفوظ ہے۔ اس میں امراضِ راس کا بیان ہے۔

7۔ مطبِ علوی خاں:

یہ حکیم علوی خاں کے مجرب نسخوں کا گراں قدر مجموعہ ہے۔

8۔ امراضِ اطفال:

بچوں کے امراض پر مشتمل یہ ایک غیر مطبوعہ رسالہ ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ حکیم محمد سعید سنٹرل لائبریری، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی میں موجود ہے۔

ناشرین کی غلطی کی وجہ سے بہاء الدولہ کی مشہور کتاب 'خلاصۃ التجارب' حکیم علوی خاں سے منسوب ہوگئی ہے اور ایک بڑے طبی حلقہ میں یہ حکیم علوی خاں کی کتاب کی حیثیت سے مشہور ہے۔ علوی خاں کی تصانیف کے ذیل میں علاج الحمیٰ، دستورِ علاج، سوء القنیہ واستسقا اور

علاج الانسان مختصر رسالے ہیں۔

تلامذہ

حکیم علوی خاں کے مشہور شاگردوں میں صاحب قرابادین جلالی حکیم شیخ جلال الدین امروہوی، حکیم محمد شریف خاں کے والد حکیم اکمل خاں اور چچا حکیم اجمل خاں اوّل کے اہم نام شامل ہیں۔

وفات

1162ھ مطابق 1749ء میں حکیم علوی خاں کا انتقال ہوا۔ان کی خواہش کے مطابق درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء، نئی دہلی میں اُنہیں دفن کیا گیا۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ اطباءِ عہدِ مغلیہ، حکیم کوثر چاند پوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

2۔ تاریخ طب واطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

3۔ دلّی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی، دہلی، اشاعت ثانی 2011ء

4۔ جہانِ طب، اپریل۔جون 2001ء، سی سی آر یوایم، نئی دہلی

5۔ جہانِ طب، جنوری۔مارچ 2002ء، سی سی آر یوایم، نئی دہلی

حکیم شاہ اہل اللہ پھلتی

حکیم شاہ اہل اللہ، شاہ عبدالرحیم کے صاحبزادے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بھائی ہیں۔ ہندوستان میں اُن کے خاندان کو علماء کے ایک نہایت عالی مرتبت خانوادے کا اعزاز حاصل ہے۔قرآن، حدیث اور علومِ اسلامیہ کے سلسلہ میں اس خاندان کو مرجعیت کا مرتبہ حاصل رہا ہے۔

حکیم شاہ اہل اللہ اسی علمی گھرانہ میں 1119 ہجری مطابق 1708ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد شاہ عبدالرحیم، بڑے بھائی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور دوسرے اساتذہ سے اسلامیات، عقلیات اور طب کی تعلیم حاصل کی۔

حکیم شاہ اہل اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم بھی طبیب تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مطابق شاہ عبدالرحیم مختلف علوم میں مہارت رکھتے تھے، مگر طب سے ان کے مزاج کو خصوصی مناسبت تھی۔

شاہ عبدالعزیز (شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے) کا بیان ہے کہ ان کے خاندان میں طب کا قدیم سلسلہ تھا۔ان کے جدامجد بھی طب سے وابستہ تھے۔شاہ عبدالعزیز کے مطابق شاہ اہل اللہ ایک ماہر طبیب تھے۔

تحصیلِ علوم کے بعد شاہ اہل اللہ نے غیر مستقل طور پر مطب کا سلسلہ شروع کیا۔ایک روز انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے، خدا بیمار ہے اس کا علاج کر!، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے یہ خواب سن کر فرمایا کہ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ فرمائے گا کہ میں بیمار تھا تو نے دوا نہ دی، میں بھوکا تھا، ننگا تھا، پیاسا تھا، تو نے کھانا، پانی اور کپڑا نہیں دیا۔ بندہ

عرض کرے گا۔ خدایا تو تو ان احتیاجات سے پاک ہے۔ اللہ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، فلاں بھوکا تھا، تو گویا میں ہی بیمار اور بھوکا تھا۔ یہ حدیث پڑھ کر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے خواب کی تعبیر یہ فرمائی کہ طب کی تحصیل کے بعد مطب نہ کرنا ایسا ہی ہے، جیسے استطاعت کے باوجود بھوکے کو کھانا نہ کھلانا۔

مطب و معالجہ سے شاہ اہل اللہ کی مستقل وابستگی میں ان کا یہ خواب ایک بڑا محرک مانا جاتا ہے۔ اس غیبی اشارہ کے بعد اُنہوں نے خادموں کو ہدایت کردی کہ کوئی مریض کسی بھی وقت آئے تو مجھے ضرور اطلاع کر دیا کریں۔ شاہ اہل اللہ مطب پر مریضوں کو دیکھنے کے علاوہ ضرورت پڑنے پر اُن کے گھر بھی جا کر دیکھتے اور تشخیص و تجویز کرتے تھے۔

مولوی سید ظہیر الدین عرف ولی اللٰہی لکھتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے برادر خورد شاہ اہل اللہ ایک ذی علم اور باکمال شخص گزرے ہیں، جو مختلف علوم وفنون میں تبحر رکھتے تھے۔ علاوہ دینی علوم کے آپ علم ویدک جو ہندوستان کا فنِ طب ہے، بڑے عالم و عامل تھے اور اس فن میں گویا اپنے وقت کے دھنتر وید تھے، جن کی تشخیص و تجویز نے ہزاروں بیماروں کو، جو لبِ گور ہو گئے تھے، پھر سے زندگی بخشی"۔

شاہ اہل اللہ اپنے والد کی حیات تک دہلی میں رہے۔ اُن کے انتقال کے بعد پھلت منتقل ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ پھلت، ضلع مظفر نگر، یو پی کا ایک قصبہ ہے، جو شاہ صاحب کا ننھیال بھی تھا اور جائے پیدائش بھی۔ شاہ ولی اللہ بھی یہیں پیدا ہوئے تھے اور ابتدائی عمر میں ان کا قیام عموماً پھلت میں رہتا تھا۔

شاہ اہل اللہ نے 1776ء میں قصبہ پھلت میں وفات پائی اور یہیں درگاہ کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔ شاہ اہل اللہ کے کچھ تبرکات اب تک پھلت میں موجود ہیں

تالیفات

انفاسِ رحیمی، تخریج احادیثِ ہدایہ، تلخیصِ ہدایہ، اصولِ فقہ، تفسیر قرآن، چہار باب، کنز الدقائق کا فارسی ترجمہ، ان کے علاوہ عقائد اور سلوک پر کئی کتابیں اُن کی قلمی یادگار ہیں۔

1۔ ترجمہ موجز القانون:

شاہ صاحب نے طب کی معروف درسی کتاب 'موجز القانون' کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ ترجمہ کے ساتھ انہوں نے اس میں کئی ضروری مسائل کا اضافہ بھی کیا تھا۔ اس ترجمہ کا ایک خطی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ شاہ صاحب کی یہ تالیف 596 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''ہر چند کہ اس کتاب کی بڑی تعداد میں شرحیں لکھی گئی ہیں، لیکن فارسی داں طبقہ اِس اہم کتاب کے مطالعہ سے محروم ہے، لہٰذا ان کے استفادہ کے لیے اس کا ترجمہ بعض مفید اضافوں کے ساتھ پیش ہے''۔

2۔ تکملۂ ہندی، تکملۂ یونانی:

طبی دنیا میں شاہ صاحب کی شخصیت انہیں دونوں تکملوں کے ذریعہ متعارف ہے۔ تکملۂ ہندی اور تکملۂ یونانی کا شمار طب کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ دونوں تکملے معالجات اور ادویہ کے موضوع پر ہیں۔ تکملۂ یونانی کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ''موجز کے فارسی ترجمہ سے فراغت کے بعد میں نے سوچا کہ نسخہائے یونانی کو بھی جمع کردوں''۔

اسی طرح تکملۂ ہندی کے آغاز میں فرماتے ہیں:

> ''تکملۂ یونانی کے ساتھ میں نے سوچا کہ ادویۂ ہندیہ بھی مرتب کردوں''۔

یہ دونوں تکملے مولوی سید ظہیر الدین عرف سید احمد ولی اللٰہی نے مطبع احمدی دہلی سے شائع کیے ہیں۔ مولوی سید ظہیر الدین، شاہ خاندان کے متاخرین میں ہیں۔ انہوں نے مطبع احمدی کو شاہ ولی اللہ کے نام، احمد سے منسوب کیا تھا۔ اس مطبع کے قیام کا مقصد شاہ خاندان کی ادبیات کو منظر عام پر لانا تھا۔ ان تکملوں پر طباعت کا سن درج نہیں ہے، لیکن ان کے سن طباعت کی تخمین یوں کی جاسکتی ہے کہ صاحب نزہۃ الخواطر جب 1894ء میں مولوی سید احمد سے دہلی میں ملے تھے تو اس وقت یہ کتاب زیر طباعت تھی۔

حکیم رحیم بخش سہارن پوری نے تکملۂ ہندی کو اردو جامہ عطا کیا ہے۔ یہ ترجمہ 'تکملۂ ہندی بزبانِ اردو' کے نام سے صفر المظفر 1324 ہجری مطابق اپریل 1906ء میں مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا ہے۔

شاہ اہل اللہ نے اپنی کتاب چہار باب کے آخری (چوتھے) باب میں جو 26 نصائح لکھے ہیں، ان میں ایک نصیحت یہ لکھی ہے کہ اپنی زندگی اور صحت کو غنیمت سمجھو اور بے ضرورت اسے ہلاکت میں نہ ڈالو۔ بیمار ہونے کی صورت میں کسی حاذق طبیب سے رجوع کرو اور خود کو اُس کے اختیار میں دے دو۔ پرہیز، دواء اور غذاء سے متعلق اس کی ہدایات کی پابندی کا التزام کرو اور دوران علاج دوسرا طبیب نہ بدلو، تا آنکہ موجودہ طبیب سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہو جائے۔

شاہ اہل اللہ نے طب سے متعلق نہایت بیش قدر علمی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ مگر ان کی تصانیف موجودہ زمانہ میں ناپید ہونے کے باعث اہل فن کی دسترس سے دور ہیں، لہٰذا مغلیہ دور کی یہ اہم شخصیت طبی حلقہ میں گمنام ہے۔ طب سے متعلق اُن کے علمی آثار کو سامنے لائے جانے کی ضرورت ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، حکیم محمود احمد برکاتی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، 1992ء

2۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، حکیم محمود احمد برکاتی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، اشاعت دوم 2006ء

3۔ نزہۃ الخواطر جلد 6، عبدالحیٔ حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدر آباد، 1978ء

4۔ تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان، حکیم نیر واسطی، عکسی اشاعت موسسہ مطالعات تاریخ پزشکی طب اسلامی و مکمل، ایران، بہمن ماہ 1382 ہجری شمسی

5۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین، حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1986ء

6۔ دہلی اور اس کے اطراف، حکیم سید عبدالحیٔ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، اشاعتِ دوم 2006ء

7۔ اردو طبی مترجمین، حکیم فخر عالم، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، دہلی، 2017ء

حکیم محمد اکبر ارزانی

محمد اکبر نام اور محمد ارزانی عرفیت تھی۔ والد کا نام میر حاجی محمد مقیم تھا۔ طبی مورخین، ارزانی کی جائے پیدائش اور مقامِ وفات کے سلسلہ میں مختلف الرائے ہیں۔ بعض نے انہیں ہندی النسل لکھا ہے، لیکن کچھ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ ارزانی کا وطن شیراز تھا۔ الگ الگ مورخین نے برہان پور (مدھیہ پردیش)، عظیم آباد (پٹنہ) اور دہلی کو ارزانی کی جائے وفات قرار دیا ہے۔ حکیم الطاف احمد اعظمی نے نزہۃ الخواطر اور تاریخ محمدی کی روشنی میں دہلی کو مقامِ وفات اور 1134ھ مطابق 1722ء کو سالِ وفات تحریر کیا ہے۔

ارزانی نہایت ذہین اور حاذق طبیب تھا۔ فارسی زبان میں طبی نصاب کی ترتیب وتدوین اور ترجمہ اس کا سب سے مہتم بالشان کارنامہ ہے۔ ارزانی نے طب کے بیشتر موضوعات مثلاً کلیات، معالجات اور قرابادین وغیرہ پر اہم مواد فارسی زبان میں یکجا کیا ہے، جس سے اس عہد کی طبی تعلیم میں مدد لی گئی اور موجودہ دور کے لیے یہ سرمایہ بیش قدر طبی مأخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

طبی کتابوں کو منصوبہ بند طریقہ سے فارسی میں منتقل کرنے کا اہم مقصد اس زبان میں تعلیمی وتدریسی ضروریات کا سامان فراہم کرنا تھا۔ اس لیے مفردات جیسے اہم موضوع پر کوئی کتاب تالیف نہ کرنا باعث حیرت معلوم ہوتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ مفردات کے موضوع پر فارسی زبان میں اختیاراتِ بدیعی، اختیاراتِ قطب شاہی اور اختیاراتِ قاسمی جیسی مفید کتابیں ادویۂ مفردہ کے موضوع پر پہلے سے دستیاب تھیں۔

فارسی زبان میں طبی کتابوں کی جمع وترتیب اور تالیف وتصنیف کا سلسلہ عہد اکبری میں شروع ہو چکا تھا، لیکن خاص درسی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر طبی سرمایہ کو فارسی میں منتقل کرنے کا خیال

سب سے پہلے حکیم اکبر ارزانی کے ذہن میں آیا۔ اُس نے منصوبہ بند طریقہ سے اس وقت کی علمی اور عوام پسند زبان میں طبّی مواد پیش کرنے کی شروعات کی اور درج ذیل کتابوں کے ترجمہ وتالیف کا اہم کام انجام دیا:

1۔ طب اکبر:

یہ ارزانی کی پہلی تالیف ہے۔اس کی ترتیب میں بیشتر حصہ 'شرح اسباب وعلامات' سے ماخوذ ہے۔تاہم اس کے کچھ مباحث قانون، حاوی، اقسرائی، سدیدی، موجز، ذخیرہ اور کفایۂ مجاہدیہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔اس طرح یہ تالیف معالجات کے موضوع پر ایک جامع مجموعہ بن گئی ہے۔ یہ اورنگ زیب کے نام معنون ہے۔ پوری کتاب 27 ابواب اور 635 فصلوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب لاہور، کانپور، لکھنؤ اور ایران سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ معالجات کے موضوع پر ایک مفصل فنی ونصابی کتاب ہے۔

اس کا اردو ترجمہ مطبع منشی نول کشور کے زیرِ اہتمام حکیم محمد حسین صدیقی نانوتوی نے 1281 ہجری مطابق 1864ء میں کیا ہے، مگر اس کی اشاعت بہت دیر سے عمل میں آئی۔ یہ پہلی بار 1870ء میں شائع ہوا تھا، جو طبّی حلقہ میں کافی مقبول ہوا، 1925 میں یہ دسویں بار طبع ہوا ہے۔ حکیم دیوان کاہن چند کپور نے بھی طبِ اکبر کا اردو ترجمہ کیا ہے، جو پہلی بار 1924ء میں طبع ہوا ہے۔

2۔ میزان الطب:

ارزانی نے یہ کتاب گھر اور رشتہ کے بچوں کے لیے تالیف کی تھی۔اس کو طبّی درس گاہوں میں بڑی مقبولیت ملی۔ یہ درس نظامی کا بھی حصہ رہ چکی ہے۔اس کتاب میں علاج ومعالجہ سے متعلق تمام ضروری مضامین سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً کلیات، علم الاغذیہ، مفردات، مرکبات اور علاج الامراض وغیرہ۔ پوری کتاب تین مقالات میں منقسم ہے۔ یہ 1700ء کی تالیف ہے۔ کئی مترجمین نے اسے اُردو جامہ پہنایا ہے۔اس کے ابتدائی مترجمین میں حکیم محمد حسن علی کا نام اہم ہے۔ان کا ترجمہ 1306 ہجری مطابق 1889ء میں مطبع جوالا پرکاش میرٹھ سے شائع ہوا ہے، جو پہلے مطبع چشمۂ فیض دہلی، پھر مطبع قیصرِ ہند دہلی سے شائع ہو چکا تھا۔اس کی ایک اشاعت مطبع

مفید عام لاہور سے بھی ہوئی ہے۔ مولانا محمد حامد علی خاں شاہ آبادی کا اُردو ترجمہ 1339 ہجری مطابق 1921ء میں مطبع نامی منشی نول کشور لکھنؤ سے گیارہویں بار شائع ہوا تھا، یہ ترجمہ 256 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک ترجمہ ادارہ المسیح سے 1923ء میں شائع ہوا تھا۔ حکیم محمد بدرالدین کشمیری نے بھی اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

3۔ مفرح القلوب:

کلیاتِ طب کی تعلیمی وتدریسی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر ارزانی نے 'قانونچہ' کی فارسی زبان میں شرح لکھی تھی، جو 623 صفحات پر محیط ہے اور پانچ مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کا شمار 'قانونچہ' کی مقبول ترین شروح میں ہوتا ہے۔ تالیف کے زمانہ ہی میں یہ کتاب طبی درسیات کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کتاب کو بھی درسِ نظامی کے مدارس میں شامل رہنے کا اعزاز حاصل ہے۔ فرخ سیر کے عہد میں اس کی تالیف کا کام مکمل ہوا۔ اب تک اس کی متعدد اشاعتیں مختلف مطابع سے عمل میں آچکی ہیں۔ 1886ء میں اسے مطبع منشی نول کشور کان پور نے شائع کیا تھا۔

اردو زبان کے چلن کے بعد منشی نول کشور نے حکیم نور کریم دریابادی سے اس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کروایا، جو اُن کے مطبع سے 1870ء میں شائع ہوا، بعدازاں حکیم سید محمد باقر سونی پتی نے سلیس اور بامحاورہ اردو میں اس کا دوبارہ ترجمہ کیا اور اس کے وضاحت طلب امور کی توضیح وتشریح کی۔ حکیم سید محمد باقر سونی پتی کا ترجمہ 'اکسیر القلوب' کے نام سے مطبع منشی نول کشور سے 1939ء میں شائع ہوا ہے۔

4۔ مجرباتِ اکبری:

اس میں ارزانی نے مختلف اطباء کے نسخے جمع کیے ہیں۔ یہ کتاب 1884ء میں مطبع منشی نول کشور، کانپور سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی ایک اشاعت فخر المطابع سے 1267 ہجری (مطابق 1851ء) میں ہوئی ہے۔ یہ 175 صفحات پر مشتمل ہے۔

حکیم واجد علی موہانی نے 1867ء میں اس کے اردو ترجمہ کا فریضہ انجام دیا ہے۔ انہوں نے اس میں ضروری توضیحات کے ساتھ کچھ آزمودہ نسخوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔

5- حدود الامراض:

ارزانی کی یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔اس میں امراض کا تعارف اور ان سے متعلق طبی اصطلاحات پیش کی گئی ہیں۔ یہ کتاب مطبع مجتبائی دہلی سے 1898ء میں شائع ہوئی ہے۔

6- قرابادین قادری:

اس کا شمار اہم قرابادینوں میں ہے۔ارزانی نے اسے اپنے پیرومرشد شیخ عبدالقادر جیلانی سے منسوب کیا ہے۔ یہ 1882ء میں مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوئی ہے۔اس میں مرکبات کو حروف تہجی کی ترتیب اور مختلف اعضاء کے امراض کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ پوری کتاب 23 ابواب میں منقسم ہے۔ آخر میں بعض ادویہ کی اصلاح اور ان کی حفاظت کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔حکیم نور کریم دریابادی نے 'کیمیائے عناصری' کے نام سے قرابادین قادری کا اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔طبی حلقہ میں یہی ترجمہ رواج میں ہے۔قرابادینِ قادری کا ایک اردو ترجمہ 'کیمیائے صحت' کے نام سے محمد اقبال بن حکیم مہتاب الدین لاہوری نے ملک دین محمد تاجرِ کتب کشمیری بازار، لاہور کی فرمائش پر انجام دیا ہے۔شوق امرتسری نے اس پر دیباچہ لکھا ہے، جو 23 جون 1925ء کا مرقومہ ہے۔ یہ ترجمہ 526 صفحات پر محیط ہے۔محمد اقبال کا یہ ترجمہ کم یاب ہے۔

7- طبِ ہندی:

یہ کتاب اطباءِ ہند کے معالجاتی تجربات پر مشتمل ہے۔اس میں دواؤں کے ہندی نام بھی دیے گئے ہیں۔

8- طب نبوی:

یہ علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب 'المنہج السوی والمنہل الروی فی الطب النبوی' کی تلخیص ہے، جسے ارزانی نے اورنگ زیب ؒ کے مطالعہ کے لیے فارسی میں تحریر کیا تھا۔

9- علاج الصبیان:

یہ امراض اطفال پر مشتمل ہے۔

10۔ تشریح الموسیقی:

تان سین کی کتاب 'بدھ پرکاش' کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ اسلامیہ کالج، پشاور (پاکستان) میں محفوظ ہے۔

حکیم اکبر ارزانی محض مصنف نہیں، بلکہ ایک عملی معالج بھی تھا۔ اس کا ذہن علاج و معالجہ میں غور و فکر کا عادی تھا۔ ارزانی کی تصنیفات، فارسی طبی لٹریچر میں نہایت اہم مقام کی حامل ہیں۔ جس زمانہ میں طب کی تعلیمی زبان فارسی تھی، اس وقت ارزانی کی بیشتر کتابیں طبی درسیات کا لازمی حصہ رہی ہیں۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ جہانِ طب، جلد 8، شمارہ 4، اپریل۔ جون 2007ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

2۔ جہانِ طب، جلد 4، شمارہ 4-3، جنوری۔ جون 2003ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

3۔ جہانِ طب، جلد 2، شمارہ 5، جولائی۔ ستمبر 2000ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

4۔ تاریخ طب و اطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

5۔ دلی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی، دہلی، اشاعت ثانی 2011ء

6۔ اطباءِ عہد مغلیہ، حکیم کوثر چاند پوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

7۔ میزان الطب (اردو)، ناشر دفتر المسیح، بازار نور الامراء، حیدرآباد دکن، طبع چہارم، 1952ء

8۔ اردو طبی مترجمین، حکیم فخر عالم، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، دہلی، 2017ء

حکیم سید جلال الدین امروہوی

شمالی ہند کے چھوٹے قصبات، جو اپنی طبّی روایات کی وجہ سے اہمیت کے حامل رہے ہیں، ان میں امروہہ بطورخاص قابل ذکر ہے۔ یہاں مغلیہ عہد ہی سے طب اور اطباء کے آثار ملتے ہیں۔ اس قصبہ کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ یہاں آج بھی یونانی طب زندہ شکل میں موجود ہے۔

یہاں کے طبیبوں کا مطب ومعالجہ کی روایت کے فروغ اور تصنیف وتالیف میں قابل ذکر حصہ ہے۔ امروہہ کے فرزندوں میں حکیم سید جلال الدین بن سعد بن محمد اپنے عہد کے جلیل القدر اور صاحبِ تصنیف طبیب گزرے ہیں۔ ان کا شمار علوی خانی سلسلہ کے طبیبوں میں ہوتا ہے۔

حکیم سید جلال الدین، امروہہ کے محلّہ لکڑا میں پیدا ہوئے، یہاں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دلّی کا رُخ کیا۔ اس وقت دلّی میں حکیم علوی خاں کا شہرہ تھا اور ان کی ذات، طبّی تعلیم کا مرجوعہ بنی ہوئی تھی۔ حکیم سید جلال الدین نے حکیم علوی خاں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا اور ان کی خدمت میں مسلسل دس برس رہ کر طب کی تعلیم اور معالجانہ مہارت حاصل کی۔ ان کا شمار علوی خاں کے نامور تلامذہ میں ہے۔ حکیم سید جلال الدین امروہوی کو سعید قادری بغدادی رامپوری (وفات 1792ء) سے بھی تلمذ تھا۔ حکیم سید جلال الدین، نواب دوندے خاں روہیلہ کے معالجِ خصوصی رہے ہیں۔

حکیم سید جلال الدین کے تلامذہ میں حکیم علیم اللہ صدیقی (وفات 1831ء) مشہور ہیں۔ حکیم علیم اللہ کا شمار صاحبِ کمال، ذی علم اور ماہرِ فن اطباء میں ہوتا ہے۔ حکیم علیم اللہ ایک طبّی خانوادہ کے بانی ہیں، جو' خاندانِ حکمت نشان' کے نام سے مشہور ہے۔

حکیم سید جلال الدین امروہوی شیخ عبداللہ قادری کے مرید تھے اور تصوف سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ تصوف میں توحیدِ وجودی پر انہوں نے کئی رسائل تالیف کیے ہیں۔

کلیات اور قرابادین کے موضوع پر ان کے دو طبی آثار یادگار ہیں۔

1۔ قرابادین جلالی:

اس کا شمار ہندوستان میں تالیف پانے والی اہم قرابادینی کتب میں ہوتا ہے۔ یہ بڑی تقطیع کے 134 صفحات پر مشتمل ہے اور 1897ء میں مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ سے دوسری بار شائع ہوئی ہے۔ اشاعت کے بعد اس کو طبی حلقہ میں بڑی مقبولیت ملی اور علمی و عملی ضرورتوں کے تحت اس سے استفادہ کیا گیا، مگر اب اس کی طباعت کو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا ہے اور یہ نایاب ہو چکی ہے، لہٰذا مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی، نئی دہلی نے 2006ء میں اس کی باز اشاعت کر کے علمی حلقہ میں متداول کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونانی طب کی جن کتابوں کو مستند اور معیاری قرار دے کر ڈرگ ایکٹ میں حوالہ کے طور پر شامل کیا گیا ہے، ان میں قرابادینِ جلالی بھی ہے۔ میں نے اس کے اردو ترجمہ کی سفارش کی تھی، اس کی بنیاد پر حکیم اجمل خاں انسٹی ٹیوٹ فار لٹریری اینڈ ہسٹوریکل ریسرچ، نئی دہلی میں حکیم محمد قاسم دہلوی کو اس کی ذمہ داری تفویض کی گئی، حال ہی میں اس ترجمہ کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

2۔ الشرح الجلالی:

یہ موجز کی شرح ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ یہ نسخہ 108 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے 1739ء میں محمد خاں رامپوری نے نقل کیا تھا۔

حکیم بایزید گنگوہی نے اپنی تصنیف 'فصول فیض اللہ خانی' میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ گنگوہی نے حکیم جلال الدین امروہوی کو 'قطب الملۃ والدین' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین، حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1986ء

2۔ آئینۂ طب، حکیم صباحت اللہ صدیقی، ناشر حکیم شعیب اختر صدیقی، 2006ء

3۔ یونانی طب میں اعلیٰ تعلیم، اصول تحقیق اور مطالعۂ مخطوطات، مرتبہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، 2011ء

حکیم محمد حسین شیرازی

حکیم محمد حسین شیرازی، حکیم محمد ہادی عقیلی کا بیٹا تھا۔ شیرازی کا شمار مغلیہ عہد کے ایسے صاحبِ تصنیف طبیبوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے یونانی طب کو علمی اعتبار سے رفعت و بلندی عطا کی ہے۔ اس نے متعدد کتابیں تالیف کی ہیں، جو طبی دنیا میں مرجع و ماخذ کی حیثیت سے متداول ہیں۔ ہندوستان اور ایران میں شیرازی کی تصانیف یکساں طور پر مقبول رہی ہیں اور ان ممالک میں اس کی کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔

حکیم محمد حسین شیرازی نے ادویہ مفردہ، ادویہ مرکبہ، کلیات اور معالجات کے موضوع پر ضخیم کتابیں تالیف کی ہیں، لیکن علم الادویہ کے موضوع پر اس کی کتابوں کو زیادہ شہرت ملی۔

1۔ مخزن الادویہ:

یہ مفردات سے متعلق نہایت ضخیم اور تحقیقی کتاب ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسے شیرازی نے 1183 ہجری مطابق 1769ء میں تالیف کیا تھا۔

نیر واسطی لکھتے ہیں:

"مخزن الادویہ ہندوستان میں پہلی بار کلکتہ سے 22 شعبان 1260ھ (مطابق 6 ستمبر 1844ء) میں حاجی حافظ احمد کبیر کی تصحیح اور حافظ آقا کربلائی محمد خاں کے حکم سے شائع ہوئی تھی اور ہندوستان میں چوتھی بار 1913ء میں مطبع منشی نول کشور، کانپور سے شائع ہوئی ہے۔ اس اشاعت میں مخزن الادویہ کے حاشیہ پر تحفۃ المومنین شائع ہوئی ہے۔ اور ایران سے 1277 ہجری (مطابق 1861ء) میں جہانگیر مرزا کی کوششوں سے شائع ہوئی"۔

مخزن الادویہ کا میرے پیش نظر نسخہ 1281 ہجری (مطابق 1864ء) میں مطبع محمدی محمد مرزا خاں، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس نسخہ کے حاشیہ پر بھی تحفۃ المومنین ہے۔

مصنف کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں شیخ الرئیس کی القانون فی الطب اور ادویۂ قلبیہ، ابن بیطار کی جامع المالقی (الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ) تذکرۂ شیخ یوسف بغدادی معروف بجامع بغدادی، تذکرۂ اولی الالباب داؤد انطاکی، زین الدین عطار کی اختیاراتِ بدیعی، میر محمد مومن کی تحفۃ المومنین، مفردات علوی خاں، دستور الاطباء اور دیگر بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اَخذِ مواد کے سلسلہ میں حکیم محمد حسین نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ کسی مصنف سے وہی ادویاتی معلومات لی جائیں، جو اس کے تجربہ و مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں اور جن معلومات کا تعلق ان کے علاقوں اور خطوں سے ہے۔

دواؤں کا تذکرہ حروف تہجی کی ترتیب پر ہے۔ مؤلف نے دوا کا نام لکھنے کے بعد اس کا تلفظ دیا ہے، پھر اس کی ماہیت، مزاج، افعال و خواص، طریقہ استعمال اور ترکیبِ تیاری بیان کی ہے۔

کتاب کے ابتداء میں مبسوط مقدمہ ہے، اس میں چودہ فصلوں کے تحت ادویہ کے کلیاتی ضابطے بیان کیے گئے ہیں۔ ابتدائی حصہ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

فصل اول : دواء، غذاء، ذوالخاصہ، مرکب القویٰ، فادزہر، دواءِ مسہل اور دواءِ ملین وغیرہ۔

فصل دوم : مرکب القویٰ، ذوالخاصہ کی تاثیر

فصل سوم : مزاج، اقسام مزاج اور درجاتِ مزاج

فصل چہارم: دواؤں اور غذاؤں کے امزجہ کی معرفت بذریعہ تجربہ و قیاس

فصل پنجم : ماہیت اور خواصِ ادویہ کے سلسلہ میں اطباء کے اختلافات

فصل ششم : ادویہ کے حصول اور ان کے تحفظ کے طریقے

فصل ہفتم : اعمارِ ادویہ

فصل ہشتم : کھانے پینے کے آداب

فصل نہم :	احراق، تحمیس، تشویہ، تقلیہ، تدبیر وغسل وغیرہ
فصل دہم :	ادویۂ مفردہ کے افعال وخواص کی معرفت
فصل یازدہم :	بعض طبی اصطلاحات کا تذکرہ
فصل دوازدہم:	بعض ہندوستانی اور ایرانی اوزان کا تذکرہ
فصل سیزدہم:	نجوم سے متعلق امور
فصل چہاردہم:	اسنادِ طب

حکیم محمد نور کریم دریابادی نے مخزن الادویہ کا اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ مطبع منشی نول کشور سے 1885ء میں دوسری بار شائع ہوا ہے۔

2۔ قرابادینِ کبیر:

محمد حسین شیرازی کی دوسری اہم کتاب 'قرابادین کبیر' معروف بہ 'مجمع الجوامع وذخائر التراکیب' ہے، بعض اہل علم نے 'جامع الجوامع' اور 'مجمع الجوامع' کو ایک کتاب سمجھا ہے اور اسی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ دو علاحدہ کتابیں ہیں۔ 'جامع الجوامع' حکیم علوی خاں کی تالیف ہے اور 'مجمع الجوامع' کے مؤلف حکیم محمد حسین شیرازی ہیں۔ 'مجمع الجوامع' کی حیثیت دراصل 'جامع الجوامع' کے تتمہ کی ہے۔ جیسا کہ خود اس کے مقدمہ سے اظہار ہوتا ہے۔ محمد حسین شیرازی لکھتے ہیں:

> ''معتمد الملوک سید علوی خاں بن حکیم محمد ہادی علوی کے چند متفرق مسودے میرے ہاتھ لگے، جس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک قرابادین اس طرز پر تالیف کرنا چاہ رہے تھے کہ پہلے مشہور مفرد دوائیں بیان کی جائیں، پھر اس مفرد کے ذیل میں ان مرکبات کا بیان ہوں، جن میں یہ مفرد دواء جزءِ خاص کے طور پر شامل ہے۔ علوی خاں کے مسودے میں مرکبات کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے۔ انہوں نے کچھ مرکبات، مفردات کے ذکر کے بغیر بھی لکھے تھے۔ پیر و مرشد حبیب اللہ نے علوی خاں کے اس نا تمام مسودے کو مکمل کرنے کا حکم دیا تا کہ حکیم علوی خاں کا یہ قیمتی علمی اثاثہ محفوظ اور لائق استفادہ ہو سکے۔ میں نے

پیرو مرشد کے امتثال امر میں 1185 ہجری (مطابق 1771ء) میں اس کتاب کی تالیف کا م شروع کیا تھا۔ قرابادین 'جامع الجوامع' اور مرکبات کی دوسری کتابوں نیز مفردات اور اصولِ تراکیب کی کتابوں سے اخذِ مواد کر کے حضرت مرشد کی جو تحقیقات اور جس قدر اُن کے تجربات و مشاہدات مل سکے، انہیں اس کتاب میں شامل کر لیا، اس کے علاوہ اس قسم کی جو تفصیلات دوسرے کتب و رسائل میں ملیں، انہیں بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے"۔

یہ قرابادین ایک مقدمہ اور 28 کتابوں پر مشتمل ہے، ہر کتاب میں چند ابواب اور ابواب کے ذیل میں چند فصلیں ہیں اور آخر میں ایک خاتمہ ہے۔ اس قرابادین کا نام 'مجمع الجوامع وذخائر التراکیب' ہے۔

'قرابادین کبیر' کلکتہ سے 1275 ہجری (مطابق 1859ء) میں اور تہران سے 1276 ہجری (مطابق 1860ء) میں شہزادہ جہاں گیر مرزا کی کوششوں سے شائع ہوئی تھی۔ ہندوستان میں اس کی دوسری اشاعت مطبع منشی نول کشور، کانپور سے دو جلدوں میں ہوئی ہے، اس پر سنہ اشاعت مذکور نہیں ہے۔

شیرازی نے 'قرابادین کبیر' میں ادویۂ جدیدہ اور ان کے طریقۂ استعمال کے عنوان سے انگریزوں کے تحقیقی ذوق اور محققانہ صلاحیتوں کی تعریف کی ہے اور ایلوپیتھی کے بعض طریقۂ علاج پر بحث بھی ہے، مثلاً اس نے 'قرابادین کبیر' میں انگریزی طب کے حوالہ سے انتقال الدم (Blood Transfusion) کا ذکر کیا ہے۔

3۔ خلاصۃ الحکمت:

محمد حسین شیرازی نے 1195 ہجری مطابق 1780ء میں کلیات سے متعلق ایک کتاب 'خلاصۃ الحکمت' تالیف کی تھی۔ دراصل یہ کتاب حکیم علوی خاں کی 'جامع الجوامع' کی پہلی جلد میں مذکور مسائل حکمیہ کی تلخیص ہے۔

4۔ دستور الشفاء:

یہ 21 ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک نسخہ نجف لائبریری میں محفوظ ہے۔

5۔ معالجاتِ امراض:

یہ معالجات کے موضوع پر ایک جامع تالیف ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن کلکتہ سے 1859ء میں شائع ہوا ہے۔

شیرازی اپنی ان بیش قدر تالیفات کے ذریعہ برصغیر کے طبّی حلقوں میں متعارف ہے۔

1205 ہجری مطابق 1790ء میں شیرازی نے وفات پائی۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ مخزن الادویہ، حکیم سید محمد حسین شیرازی، مطبع محمدی محمد مرزا خاں، دہلی، 1281 ہجری

2۔ قرابادین کبیر جلد اول، حکیم سید محمد حسین شیرازی، مطبع منشی نول کشور، کانپور، غیر مورخ

3۔ تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان، حکیم نیر واسطی، عکسی اشاعت موسسہ مطالعات تاریخ پزشکی طب اسلامی و مکمل، ایران، بہمن ماہ 1382 ہجری شمسی

حکیم محمد شریف خاں

حکیم محمد شریف خاں، محمد شاہ کے زمانہ کے نامور طبیب تھے۔ انہوں نے اپنے پیش رو بزرگوں حکیم محمد فاضل خاں، حکیم محمد اکمل خاں، حکیم محمد واصل خاں اور حکیم محمد اجمل خاں اوّل کی قائم کردہ طبّی روایتوں کو اتنا کمال بخشا کہ ان کا پورا خاندان ان کے نام سے موسوم ہوا اور ان کے ماقبل و مابعد اطباء خاندانِ شریفی کے افراد کی حیثیت سے طبّی تاریخ میں متعارف ہوئے۔ ہندوستان کی طبّی تاریخ میں کئی خانوادوں نے شہرت پائی ہے۔ مگر شریفی خانوادہ کو جو رفعت و بلندی نصیب ہوئی اس درجہ پر کوئی دوسرا طبی خانوادہ فائز نظر نہیں آتا۔

حکیم محمد شریف خاں کا یہ اہم کارنامہ ہے کہ انہوں نے مطب و معالجہ اور تصنیف و تالیف کو روایتی ڈگر سے ہٹا کر فنی اجتہاد کی راہ پر گامزن کیا۔ اُنہوں نے جس روایت کی داغ بیل ڈالی تھی، اس کی تکمیل مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے ہاتھوں ہوئی۔

ہندی عہد کی طب میں شریفی خاندان کے اثرات دوسرے خانوادوں سے بہت نمایاں ہیں۔ طب میں اس کے گہرے اثرات کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کی طبّی تعلیم و تحقیق میں اِنہیں کے وضع کردہ خطوط کی تقلید کی جا رہی ہے۔

حکیم محمد شریف خاں 1725ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور 1807ء میں وفات پائی۔ مہرولی میں حضرت بختیار کاکی کے مزار سے متصل آسودۂ خاک ہیں۔

حکیم محمد شریف خاں کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ عربی اور فارسی درسیات کی تکمیل شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مدرسہ سے کی۔ طب کی تعلیم حکیم عابد علی سرہندی، حکیم اچھے میاں، اپنے والد حکیم محمد اکمل خاں، چچا حکیم محمد اجمل خاں اوّل سے حاصل کی اور حکیم محمد اجمل خاں اوّل سے مطب سیکھا۔

تعلیم پوری کرنے کے بعد حکیم محمد شریف خاں نے مطب شروع کیا اور اس میدان میں بڑی شہرت حاصل کی۔ان کے کمال کا شہرہ سن کر تحصیلِ طب کے لیے شائقین رجوع کرنے لگے۔چنانچہ مطب کے ساتھ وہ شاگردوں کو درس بھی دیتے۔ان کے تلامذہ میں نہایت مشہور اور بلند پایہ اطباء گزرے ہیں۔رفتہ رفتہ اُن کی شہرت کا بڑھتا دائرہ شاہی محل تک پہنچ گیا اور وہ شاہ عالم کے درباری طبیب مقرر ہوئے۔بادشاہ اُن کی قابلیت اور حذاقت کا معترف تھا۔اس نے انہیں اشرف الحکماء کا خطاب عطا کیا۔

مطب و معالجہ اور درس و تدریس کے ساتھ حکیم محمد شریف خاں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔سر سید احمد خاں نے ان کے علمی تبحر اور فنی کمال کو جالینوس اور ارسطو جیسے اساطین حکماء پر فوقیت دی ہے۔

یونانی طب میں کشتوں کے فروغ میں ان کی مساعی کا بہت اہم حصہ ہے۔انہوں نے علمی طور پر یونانی مطب و معالجہ میں اس کے استعمال کی وکالت کی اور اس کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کیے۔اس کے علاوہ انہوں نے آیورویدک کی مفید صورتوں کو اپنے معمولات میں جگہ دی۔

حکیم محمد شریف خاں کا شمار کثیر التصانیف اطباء میں ہوتا ہے۔ان کی تالیفات یونانی طب کے علمی سرمایہ کا بیش قدر حصہ ہیں۔ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

1۔ علاج الامراض:

یہ فارسی زبان میں قرابادین کے موضوع پر ایک اہم تالیف ہے۔مطبع منشی نول کشور سے 1879ء میں اور مطبع مجتبائی، دہلی سے 1903ء میں چھپی تھی۔ابھی حال ہی میں سی سی آر یو ایم، نئی دہلی سے اس کی باز اشاعت ہوئی ہے۔

علاج الامراض کا پہلا اردو ترجمہ حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی نے کیا تھا، جو 1906ء میں مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔پھر حکیم فضل الرحمٰن، حکیم خواجہ رضوان احمد اور حکیم محمد کبیر الدین نے بھی اس کا اردو ترجمہ کیا۔حکیم فضل الرحمٰن کا ترجمہ 'مجربات خاندان مسیح الملک' کے نام سے 1935ء میں اور خواجہ رضوان احمد کا ترجمہ

'بڑی بیاض' کے نام سے دوجلدوں میں شائع ہوا ہے۔ حکیم محمد کبیر الدین کا ترجمہ دفتر المسیح سے 1927ء میں طبع ہوا ہے۔

2۔ تالیفِ شریفی رمفرداتِ ہندی:

یہ حکیم شریف خاں کی نہایت اہم تالیف ہے۔ یہ مطبع محمدی، لاہور سے 1302 ہجری (مطابق 1885ء) میں شائع ہوئی تھی۔ انڈین میٹریا میڈیکا کے نام سے اس کا انگریزی ترجمہ 1833ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ویدک دواؤں کے افعال وخواص کا تذکرہ ہے۔ مؤلف نے قارئین کی سہولت کے لیے دواؤں کے ہندی ناموں کے ساتھ فارسی نام بھی تحریر کیے ہیں۔

3۔ مطبِ شریف خاں:

اس میں حکیم شریف خاں نے اپنے والد اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کے ساتھ حکیم علوی خاں کے مجربات یکجا کیے ہیں۔ مطب ومعالجہ کے پہلو سے یہ نہایت بیش قدر بیاض ہے۔

4۔ رسالہ رخواص الجواہر:

یہ رسالہ، تالیفِ شریفی، مطبوعہ 1949ء کے حاشیہ پر شائع ہوا ہے۔ حکیم شریف خاں نے اس کی ایک تلخیص 'تحفۂ عالم شاہی' کے نام سے تیار کی تھی، جسے اُنہوں نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

5۔ فوائدِ شریفیہ:

یہ نفیس بن عوض کرمانی کی کتاب 'شرح الاسباب والعلامات' پر حکیم شریف خاں کے تحریر کردہ حواشی ہیں۔ یہ کتاب 560 صفحات پر مشتمل ہے۔ علی گڑھ، رامپور اور پٹنہ میں اس کے خطی نسخے محفوظ ہیں۔

6۔ عجالہ نافعہ: یہ ہندوستان کے مختلف مطابع سے شائع ہو چکی ہے۔

7۔ مدارک الحکم:

یہ کلیاتِ نفیسی پر حکیم شریف خاں کا تحریر کردہ حاشیہ ہے اور اس کے فنِ اوّل کی تشریح ہے۔

8- ترجمہ کلیاتِ قانون: یہ قانون ابن سینا کے حصہ کلیات کا فارسی ترجمہ ہے۔

9- ترجمہ حمیاتِ قانون: یہ قانون ابن سینا کے حصہ حمیات کا فارسی ترجمہ ہے۔

10- حاشیہ قانون:
یہ قانون ابن سینا پر حکیم شریف خاں کے تحریر کردہ حواشی کا مجموعہ ہے۔

11- شرح موجز: یہ موجز القانون کی شرح ہے۔

حکیم محمد شریف خاں نے طب کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ان کی غیر طبّی کتابوں میں ترجمہ وتفسیر قرآن، کاشف المشکوٰۃ (حدیث)، سوالات اربعہ (تصوف)، آثار النبوت، شرح مسلم، حاشیہ حمد اللہ (منطق) وغیرہ شامل ہیں۔ان کتابوں سے طب کے ساتھ قرآن، حدیث، تصوف اور عقلی علوم پر ان کی دستگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

حکیم شریف خاں کی تصانیف، عام طبّی حلقہ سے دور ہیں، اس لیے کہ شائع شدہ کتابیں بازار سے ناپید ہیں۔اسی طرح کچھ کتابیں مخطوطوں کی صورت میں کتب خانوں کی زینت ہیں۔لہٰذا ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کی ترتیب وتدوین اور شائع شدہ کتابوں کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت ہے۔ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ انہیں فارسی اور عربی زبانوں سے اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ موجودہ طبی حلقہ ان سے استفادہ کر سکے۔

مطالعاتی مآخذ

1- جہانِ طب، جلد 11، شمارہ 2، اکتوبر۔دسمبر 2009ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

2- اطباءِ عہد مغلیہ، حکیم کوثر چاند پوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

3- قانون ابن سینا اور اس کے شارحین ومترجمین، حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1986ء

4- دلی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی، دہلی، اشاعتِ ثانی 2011ء

5- تاریخ طب واطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

حکیم احسن اللہ خاں

حکیم احسن اللہ خاں بن حکیم عزیز اللہ صدیقی 1212ھ مطابق 98-1797ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں طب اور طبابت کا ایک قدیم سلسلہ تھا۔ حکیم احسن اللہ خاں کا نسبی سلسلہ شیخ زین ہروی سے ملتا ہے، جو ہرات سے ہندوستان آنے والے اس خاندان کے پہلے فرد تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے پردادا حکیم رحمت اللہ کو 'نظام الدولہ' اور 'عین الملک' کے خطابات حاصل تھے۔

حکیم احسن اللہ خاں نے طب کی تعلیم اپنے والد حکیم عزیز اللہ صدیقی سے حاصل کی۔ ان کا شمار مغلیہ عہد کے عظیم المرتبت طبیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے درباری طبیب تھے۔ 1837ء میں اکبر شاہ ثانی کے وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر کے دور میں بھی وہ اس منصب پر برقرار رہے۔

حکیم احسن اللہ خاں معالجانہ حذاقت، فنی کمال کے ساتھ نہایت عالی دماغ تھے، اپنی مدبرانہ اور دانشورانہ فہم وفراست کے باعث وہ مغل حکومت کے مشیر خاص رہے اور وزیر اعظم کی حیثیت سے سلطنت کے انتظامی امور میں ذمہ داریاں ادا کیں۔

حکیم احسن اللہ خاں اکبر شاہ ثانی کے عہد میں 'احترام الدولہ ثابت جنگ' کے لقب سے مفتخر ہوئے اور مدار المہمات بنائے گئے۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر سے وابستگی سے پہلے وہ نواب فخر الدولہ اور نواب فیض اللہ خاں جھجھروی کی خدمات انجام دے چکے تھے۔

سر سید احمد خاں نے 'آثار الصنادید' میں حکیم احسن اللہ خاں کے دستِ شفا اور مسیحا نفسی کا ذکر کیا ہے۔ سر سید نے ان کے حسنِ اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے،

جو حکیم احسن اللہ خاں کو اپنا محسن تصور نہ کرتے ہوں۔ مغلیہ دربار سے ان کے قرب و تعلق کا فیض اُس عہد کے بہت سے علماء اور ادباء کو بھی پہنچا۔ یہ ان کی معارف پروری اور علمی قدر افزائی کا بڑا اہم واقعہ ہے کہ غالب اور سر سید کو دربار سے وابستہ کروانے میں حکیم احسن اللہ کا بڑا اہم کردار تھا۔

1857ء میں حکیم صاحب کی شخصیت کو متہم کیا گیا اور ان پر انگریزوں سے ساز باز اور سلطنت کے خلاف مخبری کے الزام عائد کیے گئے، جن کی وجہ سے ان کی عظمت و شہرت متاثر ہوئی۔

احسن القرابادین:

حکیم احسن اللہ خاں کی تصنیفی یادگاروں میں سب سے اہم ہے۔ یہ ان کے معمولات اور مجربات کا مجموعہ ہے۔ یہ قرابادین ہنوز مخطوطہ کی شکل میں ہے۔ ہندوستان کے مختلف ذخیروں میں اس کا نسخہ موجود ہے۔ یہ 'احسن المجربات' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس قرابادین کی ترتیب و تسوید کا کام 1288ھ (مطابق 1871ء) میں مکمل ہوا تھا۔

مطب و معالجہ، شاہی دربار سے وابستگی، مختلف ریاستوں سے تعلق اور سلطنت کے انتظام و انصرام کے ساتھ حکیم صاحب درس و تدریس سے بھی وابستہ تھے۔ ان کے تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے، جنہوں نے ان سے کسب فیض کیا ہے۔

78 برس کی عمر میں 1873ء میں بروڈہ میں اُن کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مطالعاتی ماخذ

1۔ نزہۃ الخواطر جلد 7، عبدالحیٔ حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، 1979ء

2۔ اطباءِ عہدِ مغلیہ، حکیم کوثر چاندپوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

3۔ طب اسلامی برصغیر میں، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1988ء

4۔ دلّی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اشاعت ثانی اردو اکادمی، دہلی، 2011ء

حکیم ذکاء اللہ خاں

حکیم ذکاء اللہ بن اسحاق بن اسماعیل اکبر آبادی کا شمار ان کے عہد کے نامور طبیبوں میں ہوتا ہے۔ حلقۂ اطباء میں اُن کی غیر معمولی شہرت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ان کے نام سے منسوب خانوادۂ ذکائی ہندستان کا ایک معروف طبّی سلسلہ ہے۔

صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ حکیم ذکاء اللہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ تحصیل علم کے بعد ریاست گوالیار میں طبیب خاص کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

حکیم ذکاء اللہ کے دامن فیض سے بکثرت لوگوں نے استفادہ کیا، حکیم احسن اللہ خاں جیسے نامور اطباء ان کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

قرابادینِ ذکائی:

طبّی دنیا میں حکیم ذکاء اللہ نے 'قرابادین ذکائی' کے ذریعہ شہرت پائی۔ اس کا شمار قرابادینی ذخیرہ کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے خاندانی معمولات و مجربات کو جمع کیا ہے۔ اس کا اصل نام 'ملتقط ذکائیہ منتخب از مجموعۂ بقائیہ' ہے۔ اس کی ایک اشاعت 1884ء میں مطبع رائے بھوانی پرشاد، دہلی سے ہوئی ہے۔ اشاعت کے بعد یہ قرابادین طبّی حلقہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ 1907ء تک اس کی سولہ اشاعتیں آچکی تھیں۔

حکیم محمد ہادی حسین خاں مراد آبادی نے منشی نول کشور کی فرمائش پر اس فارسی قرابادین کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ 1287 ہجری مطابق 1870ء میں انجام دیا گیا ہے۔ میرے پیشِ نظر اس کی چوتھی اشاعت ہے، جو 1901ء کی ہے۔

قرابادین ذکائی میں مرکبات کا تذکرہ حروف تہجی کی ترتیب پر ہے۔ مؤلف نے متعدد

فصول اور ابواب کے تحت نسخوں کو بیان کیا ہے۔

بعض ارتجالی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم ذکاءاللہ نے 'انتخاب' کے نام سے بھی ایک کتاب تالیف کی تھی۔ اسی طرح 'حاشیہ سدیدی' کا بھی ان کی تالیفات کے ذیل میں تذکرہ ملتا ہے۔

مغل اور برطانوی عہد میں جن خانوادوں نے دلی کو طبی رونق عطا کی تھی، ان میں شریفی خاندان کے بعد بقائی اور ذکائی خاندان نہایت قابل ذکر ہیں۔ اب شریفی خاندان میں طب کی روایت تاریخ کا واقعہ بن چکی ہے، مگر بقائی اور ذکائی خاندان کے لوگ اب بھی اس روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح حکیم بقاءاللہ اور حکیم ذکاءاللہ کا طبی فیض آج بھی جاری ہے۔

حکیم ذکاءاللہ خاں نے جمعہ کی شب شوال 1209 ہجری (مطابق مئی 1795ء) میں اکبرآباد میں وفات پائی۔ مقبرہ شاہ علاءالدین میں دفن ہیں۔

مطالعاتی مآخذ

1- نزہۃ الخواطر جلد 7، عبدالحیٔ حسنی، دائرۃ المعارف، عثمانیہ، حیدرآباد، 1979ء

2- دلّی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی دہلی، اشاعت ثانی 2011ء

3- یونانی طب میں اعلیٰ تعلیم، اصولِ تحقیق اور مطالعۂ مخطوطات، مرتبہ حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، 2011ء

4- اردو طبی مترجمین، حکیم فخر عالم، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، دہلی، 2017ء

حکیم بقاء اللہ دہلوی

ہندوستان کے طبّی خانوادوں میں خاندانِ بقائی ایک بڑا ہی اہم سلسلہ ہے۔اس خاندان کے ایک بزرگ حکیم ارشد خاں، شاہ جہاں کے عہد میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ اس خاندان کی طبّی خدمات تقریباً چار صدیوں پر محیط ہیں اور یہ روایت اب تک بدستور قائم ہے۔

حکیم بقاء اللہ مغلیہ دور کے شاہی طبیب اور اپنے معاصرین میں نہایت ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔حکیم بقاء اللہ سے پہلے اور اُن کے بعد طبیبوں کی ایک سلسلۃ الذہب موجود ہے،جس نے ہندوستان اور ایران میں بڑی اہم طبّی خدمات انجام دی ہیں۔حکیم بقاءاللہ اس سلسلہ کے نہایت ممتاز اور باکمال فرد تھے۔انہی کے نام سے اس طبّی سلسلہ نے شہرت پائی اور 'خاندانِ بقائی' کے نام سے موسوم ہوا۔

دہلی میں بقائی خاندان آنکھوں کے علاج میں شہرت رکھتا ہے، دہلی کے چاوڑی بازار میں حوض قاضی کے پاس حکیم بقاء کی حویلی تھی، یہ جگہ گلی حکیم بقاء کے نام سے آج بھی معروف ہے۔

مجموعۂ بقائی:

حکیم بقاء اللہ کے طبّی آثار 'مجموعہ بقائی' کی صورت میں محفوظ ہیں، یہ دراصل ان کے مجربات و معمولات کا مجموعہ ہے،اسے اُن کے فرزندِ رشید حکیم محمد اسمٰعیل خاں المخاطب بہ طبیب خاقاں نے مرتب کیا تھا اور انہی کی نگرانی میں اس کی اشاعت ہوئی۔ یہ مجموعہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں 556 صفحات ہیں، جو یکم دسمبر 1861ء کو مطبع ہندو پریس کوچہ مائیدا س میں باہتمام پیارے لال طبع ہوئی ہے۔ دوسری جلد 512 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ فروری 1862ء مطابق شعبان 1278 ہجری میں ہندو پریس میں میاں عبدالغفور کی فرمائش پر چھپی ہے۔

بقائی خاندان کی طبی روایت کو زندہ رکھنے میں حکیم منیر الدین اور ان کے جانشینوں کا اہم کردار ہے۔ آزادی سے پہلے حکیم منیر الدین دواخانہ کے مسند نشین تھے، 1947ء کے بعد ان کے ایک بیٹے حکیم شجاع الدین کراچی چلے گئے اور دوسرے بیٹے حکیم شرف الدین نے بقائی دواخانہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ان کی اولادوں سے آج بھی دتی میں طب کی روایت زندہ ہے۔ یہ بقائی خاندان کے فرد کی حیثیت سے طب سے رشتہ استوار کیے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے اس لیے کہ ہندوستان کے بیشتر طبی خانوادے اب محض تاریخ کا حصہ ہیں اور طب سے ان کا عملی رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ ایسے دور میں بقائی خاندان کے افراد نے طب سے رشتہ قائم رکھ کر صحیح جانشین ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ دہلی کی یادگا شخصیتیں، محمد امداد صابری، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی، 1972ء

2۔ دہلی کی یادگار شخصیتیں، محمد امداد صابری، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی، 1987ء

3۔ دلی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی دہلی، اشاعت ثانی 2011ء

حکیم صادق علی خاں

حکیم صادق علی خاں 1184 ہجری مطابق 1771ء میں پیدا ہوئے۔ حکیم شریف خاں کے تیسرے صاحبزادہ ہیں۔ وہ ذہانت و ذکاوت اور فہم وفراست میں اپنے تمام بھائیوں میں سب سے بڑھ کر تھے اور دراصل انہی کے سلسلہ سے شریفی خاندان کی عظمتوں کو چار چاند لگا۔

حکیم صادق علی خاں کی علمی وفنی تربیت خود حکیم شریف خاں نے کی تھی۔انہوں نے عربی وفارسی میں عمدہ لیاقت بہم پہنچائی اور فن طب میں اعلیٰ دستگاہ اور فاضلانہ قابلیت پیدا کی۔ سرسید احمد خاں نے 'آثار الصنادید' میں ان کی علمی مہارت اور فنی قابلیت کا ذکر کیا ہے۔

حکیم صادق علی خاں مغل بادشاہ ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ بن شاہ عالم کے دربار سے وابستہ تھے۔ عمدہ خدمات کے اعتراف میں بادشاہ کی طرف سے اُنہیں جاگیر عطا ہوئی تھی۔

حکیم صادق علی خاں نے اپنے والد حکیم شریف خاں کی حیات ہی میں طب کے علمی وعملی شعبوں میں نہایت فاضلانہ لیاقت بہم پہنچالی تھی۔ شریف خاں کے انتقال کے بعد وہ ان کی جگہ مسند نشین ہوئے۔ چونکہ شریفی اطباء کے مطب، مریضوں کے ساتھ طالبانِ طب کا مرجع تھے، اس دستور کو حکیم صادق علی خاں نے بھی جاری رکھا اور مطب ومعالجہ کے ساتھ طلبہ کو درس بھی دیتے رہے۔اِن مصروفیات کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔اُن کے نام سے درج ذیل علمی آثار کا حوالہ ملتا ہے:

1۔ زادِ غریب:

یہ کتاب فارسی زبان میں ہے، اس میں سفروں سے متعلق مختلف صحتی اور طبی امور کا تذکرہ ہے۔ حکیم محمد کبیر الدین نے 'مخازن التعلیم معروف بہ زادِ غریب' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ دفتر المسیح سے 1927ء میں شائع کیا ہے۔

دراصل 'مخازن التعلیم' حکیم محمد صادق علی خاں کے بیٹے حکیم غلام مرتضٰی کی کتاب ہے۔ حکیم کبیر الدین اور کچھ ان کے ہمعصر مورخین غلطی سے 'زادِ غریب' اور 'مخازن التعلیم' کو ایک کتاب سمجھ بیٹھے ہیں۔

2۔ شرح تشریح اعضاءِ مرکبہ:

اس کتاب میں جالینوس کی منافع الاعضاء، شرحِ آملی و شرح گیلانی کے اقتباسات درج ہیں۔ یہ مطبع مجتبائی دہلی سے طبع ہوئی ہے۔ اسے حکیم محمد صادق نے 1237 ہجری (مطابق 1882ء) میں تالیف کیا تھا۔ یہ کتاب مدرسہ طبیہ کے نصاب میں بھی شامل رہی ہے۔ اس کا شمار ہندوستان میں تالیف پانے والی تشریح کی ابتدائی کتابوں میں ہوتا ہے۔ صادق علی خاں نے یہ کتاب تالیف کر کے تشریح جیسے تشنہ موضوع پر ایک مفید اضافہ کیا تھا اور اپنے عہد کے طبیبوں کی توجہ اس اہم موضوع کی طرف مبذول کی تھی۔

معاصر طبّی درس گاہوں میں تشریح کے سلسلہ میں کلیۃً جدید تشریح پر تکیہ کر لیا گیا ہے۔ خود اہل طب نے اپنے قدیم تشریحی سرمایہ کو از کار رفتہ تسلیم کر لیا ہے۔ حالانکہ جدید تشریح کو اپنانے کے بعد اطباء کے سامنے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ وہ مواد کے امالہ اور انجذاب کے فلسفے کی تشریح کس طرح کریں؟۔ ان فلسفوں سے وہ دستبردار بھی نہیں ہو سکتے اور نہ ہی وہ جدید تشریح کی روشنی میں ان کی توضیح کے اہل ہیں۔

موجودہ طبّی دنیا 'شرح تشریح اعضاء مرکبہ' جیسی کتابوں سے خود کو بے نیاز محسوس کر رہی ہے، لیکن جب اسے امالہ اور انجذاب جیسے طبّی فلسفوں کو سمجھانے کی ضرورت پیش آئے گی تو اسے اس کی اور اس جیسی تالیفات کی ضرورت بہر کیف محسوس ہوگی۔

3۔ شرح معالجات قانونچہ:

یہ ایک نا تمام کتاب ہے۔ اس میں امراضِ صدر تک کا بیان ہے۔

4۔ طریق تعلیم طفلان:

اس کتاب میں بطریق اختصار امراض کا علاج تحریر کیا گیا ہے۔

5۔ رسالہ در خواص ادویہ واغذیہ: اس میں دوائی اور غذائی اجناس کے خواص مذکور ہیں۔

6۔ تقویت العقائد: یہ غیر طبّی تالیف ہے۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ صرف اور نحو جیسے موضوعات پر بھی انہوں نے رسائل تحریر کیے ہیں۔

حکیم صادق علی خاں نے بہت طویل عمر پائی تھی۔ وہ تقریباً اسّی برس زندہ رہے۔ 1848ء میں وفات پائی۔ درگاہ حضرت سید حسن رسول نما میں مدفون ہیں۔ ان کی وفات کے بعد حکیم غلام محمود خاں، فنی وارث ہوئے اور مسندِ طبابت پر فائز ہو کر خاندانی روایت کو آگے بڑھایا۔

حکیم صادق علی خاں نے اپنے مطب میں ایک طویل عرصہ تک درس و تدریس کے بھی فرائض انجام دیے، اس لیے ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ استاذی نظام کے ذریعہ ہندوستان میں ایک مدت تک طبّی تعلیم کا سلسلہ رہا۔ لہٰذا طبّی درس گاہوں کے قیام سے پہلے جن اساتذہ کی کوششوں سے یونانی طب میں درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کو فروغ ملا، ان میں حکیم صادق علی خاں کی مساعی بہت اہم ہیں۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین، حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1986ء

2۔ دلّی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی دہلی، اشاعتِ ثانی 2011ء

3۔ تاریخ طب و اطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

4۔ خاندان شریفی، حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 2001ء

حکیم سید غلام حسنین کنتوری

حکیم سید غلام حسنین کنتوری 17 ربیع الاول 1245 ہجری مطابق 16 ستمبر 1829ء کو قصبہ کنتور، ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ کنتوری کا تاریخی نام ذاکر حسین ہے۔ ان کا نسبی تعلق نیشاپور کے موسوی سادات سے ہے۔ کنتوری کے والد محمد بخش حسینی موسوی اور ان کے جدامجد مولوی سید عبداللہ بڑے عالم گزرے ہیں۔

کنتوری نے لکھنؤ کے مدرسہ شاہی سے فارسی اور عربی ادبیات، منطق وفلسفہ اور حدیث وفقہ کی تکمیل کی۔ یہاں سے فراغت کے بعد امام باڑہ نواب آصف الدولہ میں واقع مدرسہ سلطانیہ میں ملازمت اختیار کی۔

علوم متداولہ کی تحصیل کے دوران کنتوری نے چغمنی کا 'قانونچہ' پڑھا تھا۔ یہیں سے انہیں طبی ادبیات کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں طبی علوم حاصل کرنے کا ذریعہ مشاہیر اطباء کے مطب تھے۔ مگر طب کے اس طریقۂ تعلیم سے کنتوری غیر مطمئن تھے، لہٰذا ذاتی مطالعہ سے طب میں مہارت اور کمال حاصل کیا۔

طب کے علاوہ مسمریزم اور علم کیمیاء سے کنتوری کو بڑا شغف تھا۔ انہوں نے کیمیاء میں بڑی مہارت پیدا کر لی تھی۔ ان کی صدارت میں ''انجمن الکیمیاء'' بنارس کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کا مقصد علم کیمیاء کا فروغ تھا۔ اس انجمن کے ایک آنریری ممبر حکیم دوست محمد خاں نے مالیر کوٹلہ سے ایک رسالہ 'الکیمیاء' کا اجراء کیا۔ اس میں کنتوری کے کیمیاء سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔

صنعت وحرفت سے بھی کنتوری کو دلچسپی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مدارس میں اس قسم کی

پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام ہوتا کہ یہاں کے فضلاء معاشی لحاظ سے خود کفیل ہوں، اس کے لیے کنتوری نے عملی اقدامات بھی کیے۔

کنتوری کا تعلیم کے بعد جو اسفار کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ تاحیات جاری رہا۔ اس طرح ان کی زندگی کا بڑا حصہ تلاشِ معاش کے سلسلہ میں سفر میں گزرا۔ ہندوستان کے تقریباً چالیس مقامات پر ان کا قیام رہا۔

کنتوری نے مختلف دینی موضوعات پر 21 کتابیں تالیف کی ہیں، لیکن انہیں علمی شہرت طبّی ترجمہ نگاری کی وجہ سے ملی۔ فکرِ معاش کے دوران کنتوری نے لکھنؤ میں منشی نول کشور سے ملاقات کی۔ اُنہوں نے ابتداءً 'اعجازِ خسروی' کی شرح کا کام کنتوری کے سپرد کیا، جسے انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس طرح منشی نول کشور سے کنتوری کے تعلقات استوار ہوئے اور مطبع منشی نول کشور سے اُنہیں جڑنے کا موقع ملا۔

منشی نول کشور کا مطبع محض ایک اشاعتی ادارہ نہیں، بلکہ تدوین و ترجمہ جیسے علمی کام بھی اس کے عملی دائرہ کا حصے تھے۔ کنتوری نے مطبع منشی نول کشور کے زیر اہتمام کئی طبّی کتابوں کے ترجمہ کا کام انجام دیا اور اُن کی کوششوں سے عربی و فارسی زبان کی کئی طبّی کتابیں اردو میں ترجمہ ہو کر طبّی حلقہ میں متداول ہوئیں۔

کنتوری نے جس عہد میں طبّی کتابوں کے ترجمہ کا کام انجام دیا تھا، اس سے اس عہد کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل یہ ہوئی کہ اردو زبان میں درس و تدریس میں مدد ملی۔

اس عہد میں اردو کا چلن شروع ہونے کے باوجود اطباء میں عربی و فارسی کے جاننے اور سمجھنے والے موجود تھے۔ جب کہ ہمارے عہد میں اس قسم کے لوگ عنقاء ہو چکے ہیں اور طبیبوں میں شاید چند ایسے نام مل پائیں، جو براہ راست عربی و فارسی کے طبّی سرمایہ سے استفادہ کی اہلیت رکھتے ہوں، لہٰذا یہ تراجم اس عہد سے زیادہ ہمارے عہد کی ضرورت ہیں۔ اس لیے کہ آج تعلیم و تحقیق کا سارا کام انہیں اردو ترجموں کی مدد سے انجام پا رہا ہے۔

کنتوری کے تراجم کی فہرست حسب ذیل ہے:

1۔ ترجمہ القانون فی الطب مصنفہ شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبد اللہ ابن سینا

2۔ ترجمہ کامل الصناعۃ الطبیہ مصنفہ ابوالحسن علی بن عباس مجوسی

3۔ ترجمہ قانونچہ (تلخیص قانون)، شمس الدین چغمنی

4۔ ملخص فصول بقراطی، فارسی ترجمہ

5۔ رسالہ قبریہ مصنفہ ابوالطب بقراط

کنتوری نے یہ تراجم براہ راست اصل زبانوں سے انجام دیے ہیں۔ان کے پیش نظر طبی ترجمہ نگاری کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔لہٰذا اُنہوں نے ترجمہ کے ساتھ اس کا اسلوب طے کرنے کی ذمہ داری بھی انجام دی۔

کنتوری کی کوششوں سے پہلی بار قانون کا مکمل ترجمہ ہوسکا۔طبی نصاب میں قانون کے حصہ کلیات اور حمیات کی بڑی اہمیت رہی ہے، لہٰذا کئی طبیبوں نے درسی ضرورتوں کے پیش نظر ان حصوں کو علاحدہ ترجمہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔مگر ان سب کے پیش نظر اصل قانون کے علاوہ کنتوری کا اردو ترجمہ بھی رہا ہے اور کچھ مترجمین نے تو صرف زبان کو سلیس اور بامحاورہ بنا کر کنتوری کے ترجمہ کو ایک نئے رنگ میں پیش کردیا۔کنتوری نے جس زمانہ میں القانون فی الطب اور دوسری طبی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا تھا۔اس زمانہ میں اردو زبان کا اسلوب آج سے بہت مختلف تھا، اب اس میں اتنی تبدیلیاں آگئی ہیں کہ اس نے ایک نئی شکل اختیار کرلی ہے اور اس کا اسلوب اتنا بدل چکا ہے کہ قدیم اسلوب ایک دوسری زبان معلوم ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے اطباء کی نئی نسل قانون سے استفادہ میں دشواری محسوس کررہی تھی، لہٰذا کنتوری کے ترجمۂ قانون کو موجودہ اسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت تھی۔راقم کی تحریک اور بار بار اصرار پر پروفیسر خالد زماں خاں صاحب (شعبۂ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج) اس کام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوئے۔اُنہوں نے پروجیکٹ تیار کرنے کی ذمہ داری ناچیز کے سر ڈالی۔میں نے ان کے حکم کی تعمیل کرکے حق شاگردی ادا کیا اور کنتوری کے ترجمۂ قانون کی لسانی تسہیل اور اس کی تہذیب وتدوین کا ایک منصوبہ بنایا۔اس وقت سی سی آر یو ایم، نئی دہلی کے مالی تعاون سے پروفیسر خالد زماں خاں صاحب کے زیر نگرانی یہ کام شروع ہوچکا ہے۔اُمید کہ آئندہ کچھ برسوں میں مکمل ہوکر علمی دنیا کے سامنے آجائے گا اور توقع ہے کہ اس کام کے ذریعہ قانون سے استفادہ کا چلن بڑھے گا اور اسے دیکھ کر دوسرے قدیم

اردو ترجموں کی تسہیل وتہذیب کی ضرورت محسوس کی جائے گی۔

89 برس کی عمر میں 17 دسمبر 1918ء کو کنتوری نے وفات پائی۔

مطالعاتی ماخذ

1۔ حکیم سید ظل الرحمان: ایک مطالعہ، حکیم فخر عالم، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، 2010ء

2۔ نزہۃ الخواطر جلد 8، عبدالحیٰ حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، 1978ء

3۔ تذکرہ اطباءِ اودھ، حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، ادارہ ادبیات، دلی، 2008ء

4۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین ومترجمین، حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1986ء

5۔ اردو طبی مترجمین، حکیم فخر عالم، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، دہلی، 2017ء

حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی

مطبع منشی نول کشور کے مترجمین میں حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی ایک اہم نام ہے۔ مرادآبادی کا نام ان مترجمین میں سرفہرست ہے جنہوں نے فارسی طبی ادبیات کے ایک بڑے حصہ کو براہ راست اردو زبان میں منتقل کیا، ان تراجم کے ذریعہ اردو زبان میں تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کی راہیں استوار ہوئیں۔

ذخیرۂ خوارزم شاہی:

حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی ولد حاجی محمد ہادی علی خاں کا ترجمہ نگاری کے حوالہ سے سب سے مہتم بالشان کارنامہ 'ذخیرہ خوارزم شاہی' کا اردو ترجمہ ہے۔ ہادی حسین نے یہ ترجمہ منشی نول کشور کی فرمائش پر انجام دیا تھا۔ ترجمہ کی ابتداء میں منشی جی کی علمی عنایتوں کا نہایت نیازمندانہ انداز میں اعتراف کیا ہے۔

حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی نے یہ ترجمہ 1287 ہجری (مطابق 1870ء) میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں مکمل ہوا۔ اس قلیل مدت میں دس جلدوں کے ترجمہ سے حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی کی ترجمہ نگاری پر قدرت اور سرعت دونوں کا پتہ چلتا ہے۔ مطبع منشی نول کشور سے اس ترجمہ کی چوتھی اشاعت 1903ء میں ہوئی تھی، اس کی ایک عکسی اشاعت، ادارہ کتاب الشفاء، نئی دہلی سے 2010ء میں ہوئی ہے۔

قرابادینِ ذکائی:

حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی نے حکیم ذکاء اللہ کی قرابادینِ ذکائی کو بھی اردو جامہ عطا کیا ہے۔ قرابادین ذکائی کا اردو ترجمہ 396 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ترجمہ کا

پہلا ایڈیشن 1870 ہجری مطابق 1287ء میں اور دوسرا ایڈیشن 1887ء میں مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوا تھا۔

ذخیرہ خوارزم شاہی اور ترجمہ قرابادین ذکائی کی تمہید کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی مطبع منشی نول کشور کے دارالترجمہ سے وابستہ تھے اور اُنہوں نے اسی مطبع کی فرمائش پر طبی کتابوں کے ترجمے انجام دیے ہیں۔

کفایۂ منصوری :

کفایہ منصوری ، میر غیاث الدین منصور بن میر صدر الدین محمد حسینی شیرازی کی تالیف ہے۔ غیاث الدین منصور نے یہ کتاب ، ابوصالح منصور بن اسحاق کے لیے تالیف کی تھی، حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی نے اس اہم تالیف کو اردو قالب عطا کر کے اردو داں طبی قاری کو ایک نہایت بیش قدر نذرانہ پیش کیا ہے۔

قرابادینِ شفائی :

حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی نے مظفر بن محمود الحسینی الشفائی کی کتاب 'قرابادین شفائی' کا 1286 ہجری مطابق 1869ء میں فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ چوتھی بار 1910ء میں مطبع منشی نول کشور، کان پور سے شائع ہوا ہے۔

زادِ غریب :

یہ حکیم صادق علی خاں بن حکیم شریف خاں کی تالیف ہے۔ حکیم ہادی حسین مرادآبادی نے اسے بھی اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ یہ ترجمہ دوسری بار دسمبر 1919ء میں مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوا ہے۔

غنیٰ منیٰ :

حکیم ہادی حسین مرادآبادی کے تراجم میں غنیٰ منیٰ مؤلفہ نوح القمری کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مگر اس وقت دستیاب ترجمہ حکیم سید منور حسین لکھنوی کا ہے، جو دواخانہ معدن الادویہ لکھنؤ کا مطبوعہ ہے۔ یہ حکیم سید محمد قاسم کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔ 2008ء میں سی سی آر یو ایم، نئی دہلی سے اس کی باز اشاعت ہوئی ہے۔

علاج الامراض :

حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی نے حکیم شریف خاں کی اس فارسی تالیف کا اردو ترجمہ کیا تھا، جو جمادی الثانی 1289 ہجری مطابق اگست 1286 ہجری مطابق 1869ء میں اردو ترجمہ کیا تھا، جو جمادی الثانی 1289 ہجری مطابق اگست 1872ء میں مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوا ہے۔ 2005 میں سی سی آر یو ایم، نئی دہلی سے اس کی بازاشاعت ہوئی ہے۔

علاج الامراض کا اردو ترجمہ 'بڑی بیاض' کے نام سے حکیم خواجہ رضوان احمد نے بھی کیا ہے۔ یہ 'دارالتالیفات' سے شائع ہوا ہے۔ حکیم محمد کبیر الدین کے تراجم کی فہرست میں بھی 'علاج الامراض' کا نام شامل ہے۔

دستور الاطباء :

یہ حکیم سلطان علی طبیب خراسانی کی معالجات کے موضوع پر ایک جامع تالیف ہے۔ اس میں امراض کی ماہیت، اسباب وعلامات اور علاج کو اختصار، مگر جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ہادی حسین مرادآبادی نے 'دستور الاطباء' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ 768 صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنؤ سے 1306 ہجری مطابق 1889ء میں شائع ہوا ہے۔

قرابادینِ کبیر:

حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی نے حکیم سید محمد حسین خاں کی اس قرابادین کو بھی اردو جامہ عطا کیا ہے۔ یہ دو جلدوں میں مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ پہلی بار 1890ء میں شائع ہوا تھا۔

کنزالاسرار:

حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی کی اس تالیف کا علم مطبع منشی نول کشور کی فہرستِ مطبوعات سے ہوتا ہے۔ اس کتاب سے مرادآبادی کی تصنیفی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے، جب کہ اُن کے باقی دوسرے کام ترجمہ نگاری سے متعلق ہیں۔

مطالعاتی مآخذ

1- جہان طب، جلد 5، شمارہ 3، جنوری۔ مارچ 2004ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

2- جہان طب (تکمیل الطب کالج نمبر)، جلد4، شمارہ2-1، جولائی۔دسمبر2002ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

3- حکیم سید ظل الرحمان۔ایک مطالعہ، حکیم فخر عالم، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، 2010ء

4- ترجمہ ذخیرہ خوارزم شاہی، محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی، عکسی اشاعت، ادارہ کتاب الشفا، دہلی، 2010ء

5- تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان، حکیم نیر واسطی، عکسی اشاعت موسسہ مطالعات تاریخ پزشکی طب اسلامی و مکمل، ایران، بہمن ماہ 1382 ہجری شمسی

حکیم نور کریم دریابادی

انیسویں صدی میں طبی کتابوں کے اردو ترجمہ کا کام انجام دینے والوں میں حکیم نور کریم دریابادی ایک اہم نام ہے۔ حکیم نور کریم بن مخدوم بخش بن کریم بخش قدوائی دریابادی انیسویں صدی کے مشہور عالم طبیب ہیں۔ دریاباد میں 1215 ہجری مطابق 1800ء میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو ونما پائی۔ مولانا عبدالحکیم بن عبدالرب لکھنوی اور یہاں کے دوسرے علماء سے مروجہ علوم کی تحصیل کے بعد حکیم محمد علی بن غلام نبی لکھنوی سے طب کی تعلیم حاصل کی۔

مروجہ درسیات کی تکمیل کے بعد لکھنؤ میں مقیم رہے اور یہاں ایک عرصہ تک تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دیے، نیز کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔ تعلیم وتدریس اور عربی زبان میں مہارت رکھنے کے علاوہ طب میں کمال کے درجہ پر فائز تھے۔ ان کی تالیفات ان صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ طب میں ان کے درک ومہارت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ریاست بڑودہ نے انہیں طبیبِ خاص کے عہدہ کی ذمہ داری دی تھی۔ انہوں نے بڑودہ ہی میں بروز جمعہ 6 رجب 1288 ہجری مطابق 22 دسمبر 1871ء کو وفات پائی۔

1۔ شفاء الامراض:

اس کا شمار دریابادی کے بیش قدر فنی کاموں میں ہوتا ہے۔ یہ ان کی بے حد اہم تالیفی کاوش ہے، جو معالجات کے موضوع پر سوال وجواب کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ میرے پیش نظر نسخہ 1877ء کا مطبوعہ ہے، جو مطبع مجمع العلوم، لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ غالباً یہ اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ہے، اس کے آخر میں دوسری اور تیسری اشاعت کی تاریخ پر مشتمل قطعات شامل ہیں، جن میں ان اشاعتوں کے سنین بیان کیے گئے ہیں۔ دیباچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب شیخ علی بخش کی فرمائش پر تحریر کی گئی تھی۔

2۔ ترجمہ مخزن الادویہ:

'مخزن الادویہ' فارسی زبان میں ادویہ مفردہ کے موضوع پر نہایت بیش قدر کتاب ہے۔ حکیم نور کریم دریابادی نے اسے اردو میں منتقل کر کے اس کے علمی استفادہ کے دائرہ کو وسیع کیا ہے۔ یہ اردو ترجمہ 1885ء میں مطبع منشی نول کشور سے دوسری بار شائع ہوا تھا۔

3۔ اکسیر القلوب:

'قانونچہ' کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ حکیم اکبر ارزانی نے 'مفرح القلوب' کے نام سے فارسی زبان میں 'قانونچہ' کی شرح لکھی تھی۔ اس کا شمار 'قانونچہ' کی مشہور شروح میں ہوتا ہے۔ حکیم نور کریم دریابادی نے ارزانی کی اس شرح کو 'اکسیر القلوب' کے نام سے اردو جامہ پہنایا۔ یہ ترجمہ 1870ء میں مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوا تھا۔ طبی حلقہ میں اس ترجمہ کی پزیرائی کو دیکھتے ہوئے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

2010ء میں سی سی آر یو ایم، نئی دہلی نے عربی، فارسی اور اردو کی نایاب اور نادر طبی کتابوں کی باز اشاعت کا منصوبہ بنا کر بہت سی اہم کتابیں شایع کیں۔ اس کے تحت 'اکسیر القلوب' کی اشاعت بھی عمل میں آئی ہے۔

4۔ کیمیاءِ عناصری:

یہ حکیم اکبر ارزانی کی تالیف 'قرابادین قادری' کا اردو ترجمہ ہے۔ حکیم نور کریم دریابادی نے مالک مطبع اودھ اخبار کی فرمائش پر اسے انجام دیا تھا۔ یہ ترجمہ چھٹی بار مطبع نامی منشی نول کشور لکھنؤ سے جولائی 1888ء مطابق شوال 1305 ہجری میں طبع ہوا تھا۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر کے مطابق مذکورہ تراجم کے علاوہ کئی رسائل بھی دریابادی کی علمی یادگار ہیں۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ نزہۃ الخواطر جلد 7، عبدالحیُ حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، 1979ء

2۔ تذکرۂ اطباءِ اودھ، حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، ادارہ ادبیات دلی، 2008ء

3۔ قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین، حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویزن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 1986ء

4۔ شفاء الامراض، نور کریم دریابادی، مطبع مجمع العلوم، لکھنؤ، 1877ء

حکیم محمد اعظم خاں

حکیم محمد اعظم خاں 1229ھ مطابق 1813ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے طب کی تعلیم حکیم نورالاسلام سے حاصل کی تھی، جو حاذق طبیب اور شاہ رفیع الدین دہلوی کے پوتے تھے۔ حکیم اعظم خاں کا شمار علوی خانی سلسلہ کے طبیبوں میں ہوتا ہے، اس لیے کہ ان کے استاذ حکیم نورالاسلام حکیم علوی خاں کے تلامذہ میں تھے۔

حکیم اعظم خاں کے اجداد خراسانی الاصل تھے اور سپہ گری کے پیشہ سے وابستہ تھے۔ مگر ان کے والد طب کی طرف متوجہ ہوئے، انہوں نے حکیم سعد اللہ خاں سے طب کی تعلیم حاصل کی اور رام پور میں بحیثیت طبیب امتیاز پیدا کیا۔

حکیم اعظم خاں 1251ھ مطابق 1835ء میں 22 برس کی عمر میں رام پور سے ترکِ سکونت کر کے بھوپال پہنچے۔ ملازمت کے سلسلہ میں اندور اور اجین میں بھی ان کا قیام رہا۔ 1882ء میں حکیم صاحب رام پور آئے تھے۔ زندگی کے آخری ایام اندور میں گزارے۔ 4 محرم 1320ھ مطابق 13 اپریل 1902ء بروز دوشنبہ 91 برس کی عمر پا کر اندور میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

حکیم اعظم خاں کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ اُنہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اعظم تخلص کرتے تھے۔ راسخ سے تلمذ تھا۔ حکیم اعظم خاں کی پوری زندگی تقویٰ اور پرہیزگاری میں گزری۔ وہ حضرت شاہ محمد امیر رام پوری سے بیعت تھے۔

حکیم محمد اعظم خاں کا شمار ہندوستان کے عظیم صاحبِ تصنیف طبیبوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ فارسی طبی ادب میں بیش قدر اضافہ کیا ہے۔

درج ذیل تصانیف ان کی یادگار ہیں:

1۔ اکسیر اعظم:

چار جلدوں پر مشتمل، معالجات کے موضوع پر ایک مہتم بالشان تالیف ہے۔ یہ کتاب علمی طور پر سند اور حوالہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں حکیم اعظم خاں نے پیش رو مصنفین کی معلومات کو اپنے تجربات کی روشنی میں پیش کیا ہے، یہ کتاب اندور کے مہاراجہ تکوجی راؤ ہولکر کے نام معنون ہے۔ اس کے مشمولات حسب ذیل ہیں:

الف۔ جلدِ اول : امراض راس، امراضِ عین، امراض گوش، امراضِ انف

ب۔ جلدِ دوم : امراضِ دہان، امراض اسنان ولثہ، امراض حلق، امراضِ مری، امراض صدر وریہ، امراض قلب، امراضِ معدہ

ج۔ جلدِ سوم : امراضِ جگر، امراضِ مرارہ وطحال، امراضِ گردہ ومثانہ، امراضِ اعضاءِ مردانہ، امراضِ صفاق، امراضِ رحم

د۔ جلدِ چہارم : امراضِ ظہر واطراف، حمیات، اورام و بثور، امراضِ شعر، امراض متفرقہ اکسیر اعظم کی پہلی جلد بڑی تقطیع کے 544 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مطبع نظامی، کان پور سے 1871ء میں شائع ہوئی ہے، دوسری جلد 572 صفحات پر مشتمل ہے یہ 1872ء میں مطبع نامی سے طبع ہوئی ہے۔ تیسری جلد 782 صفحات پر مشتمل ہے یہ مطبع نامی سے 1872ء میں چھپی ہے، جلد چہارم 720 صفحات پر مشتمل ہے، اس کی طباعت 1873ء میں مطبع نظامی، کان پور سے عمل میں آئی ہے۔

مہاراجہ تکوجی ہولکر نے یہ کتاب شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کو اندور آمد کے موقع پر بطور تحفہ پیش کی تھی۔ ایڈورڈ ہفتم نے اس کتاب کو بے حد پسند کیا اور لندن میں اس کا انگریزی ترجمہ ہوا۔ اردو میں بھی اس کی ایک تلخیص شائع ہوئی ہے۔

2۔ محیط اعظم:

یہ فارسی زبان میں ادویہ مفردہ کی چار جلدوں پر مشتمل نہایت جامع تالیف ہے۔ اس میں مفرد دواؤں کی قدیم معلومات، مصنف کے تجربہ کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

ادویہ کے مختلف ناموں اور ادویہ کے سلسلہ میں ہندی عہد کی معلومات نے اس کتاب کو بے حد وقیع بنا دیا ہے۔ 1402 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مطبع نظامی سے 1897ء میں چھپی ہے۔ اس کی تالیف میں حکیم اعظم خاں نے 68 سے زائد کتابوں کی مدد لی ہے۔ اس میں ادویہ کے ناموں کی تحقیق کے ساتھ ان کی ماہیت، مزاج اور افعال و خواص کا بیان ہے۔ اعظم خاں کی یہ اہم تالیف فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے ایک بڑے طبی حلقہ کی دسترس سے باہر تھی اور فارسی سے نابلد اطباء اس سے مستفید نہیں ہو پا رہے تھے۔ لہٰذا اسے اردو میں منتقل کیے جانے کی ضرورت تھی۔ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی کے زیر اہتمام، محیط اعظم کے ترجمہ کا کام حال ہی میں مکمل ہوا ہے۔ اسے حکیم عبدالمجید قاسمی نے انجام دیا ہے۔

3۔ رموز اعظم

اس میں معالجات کا بیان ہے۔ یہ کتاب مجربات اور طبی اخلاقیات کے حوالہ سے بہت اہم ہے۔ دو جلدوں میں 820 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 1902ء میں مطبع صدیقی، دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ حکیم محمد اعظم خاں نے یہ کتاب بھوپال کے زمانہ قیام میں نواب جہانگیر محمد خاں کی فرمائش پر تالیف کی تھی۔

4۔ قرابادین اعظم

یہ کتاب ادویہ مرکبہ پر مشتمل ہے۔ 1884ء میں مطبع نظامی، کان پور سے طبع ہوئی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ 1894ء میں شائع ہوا ہے۔ حکیم محمد حسن حاذق میرٹھی اس کے مترجم ہیں۔ حکیم سید ظل الرحمان نے اپنے دادا حکیم سید کرم حسین کو شریک مترجم لکھا ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ حکیم محمد اعظم خاں کی فرمائش پر ان کے شاگرد حکیم اکمل خاں نے بعض مجرب نسخوں کا قرابادین اعظم میں اضافہ کیا ہے۔ اضافہ کے بعد یہ 'قرابادین اعظم و اکمل' کے نام سے موسوم ہوئی، اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اسے مولوی عظمت علی حسرت لکھنوی نے انجام دیا ہے۔

5۔ نیر اعظم:

174 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں نبض کا تذکرہ ہے۔ مطبع اندور سے 1858ء میں اور مطبع نظامی، کان پور سے 1880ء میں شائع ہوئی ہے۔

6۔ رکن اعظم:

اس کتاب میں بحران کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ 80 صفحات کی یہ کتاب 1877ء میں طبع ہوئی ہے۔

7۔ اسماء الادویہ:

اس کتاب میں یونانی دواؤں کے مختلف زبانوں کے نام تحریر کیے گئے ہیں۔ ہم معنیٰ ناموں کی یہ فہرست اس اعتبار سے بہت دلچسپ ہے کہ اس سے یونانی، سریانی، لاطینی، بربری، فارسی، ہندی اور دوسری زبانوں کی مترادف اصطلاحیں سامنے آتی ہیں۔ اس کتاب میں 3529 ادویہ کے مترادف نام بلحاظ حروف تہجی تحریر ہیں، جس میں کچھ دواؤں کا الگ الگ ناموں سے تکرار اور اعادہ بھی ہے۔ اسماء الادویہ کا ایک نسخہ ابن سینا اکیڈمی علی گڑھ میں موجود ہے۔ حکیم سید ظل الرحمان نے اس نسخہ کی، محیط اعظم اور طبی لغت کی کتابوں سے مدد لے کر تصحیح کی ہے۔

مطالعاتی مآخذ:

1۔ اطباءِ عہدِ مغلیہ، حکیم کوثر چاند پوری، ہمدرد اکیڈمی، کراچی، 1960ء

2۔ جہان طب، جلد 2، شمارہ 5، جولائی۔ ستمبر 2000ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

3۔ جہان طب، جلد 1، شمارہ 4، اپریل تا جون 2000ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

4۔ آئینہ تاریخ طب، حکیم سید ظل الرحمان، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، 2001ء

5۔ تاریخ طب و اطباءِ دورِ مغلیہ، الطاف احمد اعظمی، 1992ء

6۔ اخلاقیاتِ طب، حکیم محمد اعظم خاں، ترجمہ و تلخیص حکیم مولوی محمد علی شاکر فریدی، انجمن پریس، کراچی، 1978ء

7۔ اسماء الادویہ، حکیم محمد اعظم خاں، مرتبہ حکیم سید ظل الرحمان، پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 2002

حکیم حسن رضا خاں

حکیم حسن رضا خاں کا شمار لکھنؤ کے مشہور طبیبوں میں ہوتا ہے۔ لکھنؤ کا مشہور طبی گھرانہ 'خاندانِ رضا' انہیں کے نام موسوم ہے۔ حکیم محمد علی اس سلسلے کے اولین بانیوں میں ہیں، جو کشمیر سے آئے تھے۔

حکیم رضا خاں، حکیم علی رضا خاں کے فرزند تھے۔ وہ 1814ء میں لکھنؤ کے محلہ جھوائی ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد عربی درسیات کی تکمیل مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی اور دوسرے علماءِ فرنگی محل سے کی۔ حکیم حسن رضا خاں کے پھوپھا حکیم محمد یعقوب لکھنؤ کے نامور طبیب تھے، دراصل انہی کے توسط سے دہلی کے مقابلہ میں لکھنؤ کو طبی مرکزیت کا درجہ حاصل ہوا اور انہوں نے مخصوص نظریات اور فنی امتیازات کے ذریعہ لکھنؤ کو ایک علاحدہ اسکول کی حیثیت سے شناخت عطا کی۔ اسی نادر روزگار سے حکیم حسن رضا نے طب کی تعلیم حاصل کی اور اُن کے مطب میں بیٹھ کر مریضوں کے معائنہ، مرض کی تشخیص اور نسخہ کی تجویز کا ہنر سیکھا۔ فاضل استاذ کی تربیت اور فطری صلاحیتوں کی وجہ سے حکیم حسن رضا خاں نے بہت جلد طب میں درک و مہارت پیدا کر لی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد لکھنؤ میں مطب شروع کیا۔ رفتہ رفتہ ان کی حذاقت کا شہرہ شاہی محلات تک پہنچ گیا۔ چنانچہ عمائدینِ لکھنؤ اور نوابین بھی اُن سے رجوع کرنے لگے۔

لکھنؤ کے علاوہ مشرقی اتر پردیش کے کئی رؤساء حکیم صاحب کے زیر علاج رہے ہیں۔ اجودھیا کے راجہ مان سنگھ، امیٹھی کے رئیس راجہ لال مادھو اور راجہ صاحب بنارس کے یہاں طبیبِ خاص کی حیثیت سے اُن کو خدمت انجام دینے کا موقع ملا۔ راجہ بنارس کے یہاں تقریباً دس برس تک انہوں نے علاج و معالجہ کا فریضہ انجام دیا، پھر نواب کلب علی خاں رام پور کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئے۔

حکیم حسن رضا خاں زیادہ تر لکھنؤ کے باہر نوابین، راجاؤں، رؤساء اور تعلقداروں کے معالج رہے، مگر جہاں بھی رہے مطب کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح تلامذہ کی ایک کثیر جماعت پیدا کردی۔ لکھنؤ، فیض آباد، بنارس اور رامپور میں طلبہ نے حکیم صاحب سے استفادہ کیا اور ان شہروں میں کثرت سے اُن کے طلبہ پائے جاتے ہیں۔ تذکرہ کاملانِ رامپور کے مطابق حکیم حسن رضا کے شاگردوں میں حکیم سجاد موہانی، حکیم مرزا محمد مہدی لکھنوی، حکیم کمال الدین مہندس لکھنوی، حکیم راجہ رائے دین بہادر لکھنوی۔ فیض آباد میں حکیم سلطان علی، حکیم راحت حسین، حکیم عبدالشکور۔ بنارس میں حکیم بنارسی داس، حکیم عبدالقیوم، حکیم محمد سلیمان، حکیم رضا علی، حکیم ابن حسن، حکیم آل نبی، حکیم ولی اللہ، حکیم عبدالمجید معروف ہیں۔ رامپور میں آپ کے دونوں صاحبزادے، حکیم احمد رضا خاں، حکیم حسین رضا خاں، حکیم حیدر علی خاں رامپوری، حکیم فتح علی خاں رامپوری اور حکیم خورشید حسن مشہور ہیں۔

حکیم حسن رضا خاں نے حکیم یعقوب سے طب کی تعلیم پائی تھی اور انہی کی صاحبزادی سکینہ خانم سے ان کی شادی ہوئی۔ حکیم حسن رضا خاں کے دو صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں تھیں۔ ان میں حکیم احمد رضا اور حکیم حسین رضا نے طب میں مہارت پیدا کی اور اس کے احیاء و فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

حکیم حسن رضا خاں نے مطب و معالجہ اور درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی سلسلہ رکھا۔ ان کی درج ذیل تصانیف کے حوالے ملتے ہیں:

1۔ قرابادین: یہ فارسی زبان میں ہے۔

2۔ شرحِ رسالہٗ اسحاق بن سلیمان اسرائیلی

یہ رسالہ حکیم حسن رضا کے شاگرد، حکیم حیدر علی خاں مستعار لے گئے تھے، وہ ان سے ضائع ہوگیا۔

3۔ رسالہٗ علاجِ ذکور وانوث: بہ زبان فارسی

4۔ رسالہٗ استخراجِ مزاجِ نسخہ:

مذکورہ تصانیف مخطوطہ کی شکل میں ان کے خاندان کے افراد کے پاس محفوظ ہیں۔ اب تک یہ شائع نہیں

ہو سکی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ چند رسائل ناتمام اور نامعلوم الاسم بھی ہیں۔
حکیم حسن رضا خاں رامپور کے زمانہ قیام میں سل میں مبتلا ہو گئے تھے۔ 1875ء میں 61 برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ لکھنؤ میں جھوائی ٹولہ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

مطالعاتی مآخذ

1- تذکرۂ خاندانِ عزیزی، حکیم سید ظل الرحمٰن، ابن سینا اکاڈمی، علی گڑھ، اشاعت ثانی 2009ء

2- تذکرۂ اطباءِ اودھ، حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، ادارۂ ادبیات، دلی، 2008ء

3- جہانِ طب (تکمیل الطب کالج نمبر)، جلد 4، شمارہ 1، 2، جولائی۔ دسمبر 2002ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

4- تذکرۂ کاملان رامپور، حافظ احمد علی خاں شوق، ہمدرد پریس، دہلی، اشاعت اوّل مارچ 1929ء

حکیم غلام محمود خاں

حکیم غلام محمود خاں، حکیم شریف خاں کے پوتے اور حکیم صادق علی خاں کے بیٹے ہیں۔ حکیم غلام محمود خاں کے سوانحی حالات بیان کرتے ہوئے خواجہ احسان اللہ خاں لکھتے ہیں: ان کی پیدائش 1235 ہجری مطابق 1820ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ایک مولوی صاحب کے ذریعہ کرائی گئی۔ شروع میں پڑھائی کی طرف ان کی توجہ بہت کم تھی۔ ایک بار اپنے والد کی فہمائش پر انہوں نے عہد کیا کہ کوئی لغو کام نہیں کریں گے، جب تک کہ فنِ طب میں دسترس نہ حاصل کرلیں۔ چنانچہ ایک قلیل عرصہ میں ایک قابل اور لائق طبیب بن گئے۔

حکیم غلام محمود خاں نے اپنے والد حکیم صادق علی خاں، بڑے بھائی حکیم غلام محمد خاں اور خاندان کے دوسرے بزرگوں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور تشخیص و تجویز میں کمال کی صلاحیت پیدا کی۔ ان سے پہلے ان کے بزرگوں نے طبی حذاقت کی جو اعلیٰ روایت قائم کی تھی، حکیم غلام محمود خاں نے اس میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

حکیم صادق علی خاں کے انتقال کے بعد حکیم غلام محمود خاں نے باپ کی جگہ سنبھالی اور خاندانی مسند کو علاج و معالجہ اور تعلیم و تدریس کا ایک قابلِ اعتبار مرکز بنا دیا۔

حکیم غلام محمود خاں کی مسند نشینی ایک ایسے زمانہ میں ہوئی، جب قدرداں حکومت کے لیے خود اپنا وجود سنبھالنا اور اسے قائم رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ حکومت کے ساتھ علوم و فنون سے لے کر تہذیب و اقدار سب ہی مغربی یورش کی زد میں تھے۔

1857ء کے بعد جب انگریزوں کو ہندوستان پر مکمل تسلط مل گیا تو انہوں نے نہ صرف ایلوپیتھی طریقۂ علاج کو منظم صورت میں فروغ دینے کی اسکیم تیار کی، بلکہ یہاں کی دیسی طبوں کو

پہلے راہ سے ہٹانا ضروری خیال کیا۔ اس مشکل دور میں فنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا نہایت مشکل امر تھا۔ مگر حکیم غلام محمود خاں نے اس دشوار مرحلہ کو بڑے ہی سلیقہ سے عبور کیا۔

حکیم غلام محمود خاں نے حذاقت اور مہارت کا معجزہ ایک ایسے عہد میں دکھایا اور یونانی طب کا چراغ روشن کیا، جب یونانی طریقۂ علاج، حکمراں سرپرستی سے محروم ہو چکا تھا اور یونانی طب ایک قصۂ پارینہ بنتے جا رہی تھی۔

حکیم غلام محمود خاں کا مطب، عوام و خواص، ہر ایک کا مرجع تھا۔ اُن کے مطب پر ایک میلہ سا لگتا تھا، یہاں سیکڑوں مریض شفایاب ہوتے تھے۔ حکیم غلام محمود خاں مفردات اور کشتہ جات سے علاج کرتے تھے۔ اُن کے مطب میں امیر و غریب کی تفریق نہیں تھی، ہر مریض کے ساتھ یکساں برتاؤ ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک بڑے رئیس نہایت خدم و حشم کے ساتھ اُن کے مطب میں آئے، اُس وقت محمود خاں کے پاس ایک غریب مریض بیٹھا تھا، جو نبض دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا چکا تھا، مگر وہ رئیس، غریب مریض کو پیچھے کر کے خود آگے بڑھ گیا۔ حکیم غلام محمود خاں نے رئیس کی اس حرکت پر سخت ردعمل اور خفگی کا اظہار کیا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک حاذق معالج تھے، بلکہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے حامل بھی تھے۔

حکیم غلام محمود خاں دلی کی سماجی زندگی میں نہایت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ 1857ء کے زمانہ میں جب یہاں ہر شخص غیر محفوظ تھا، حکیم غلام محمود خاں نے اس ابتلاء کے دور میں دلّی کے بے شمار لوگوں کو تحفظ فراہم کیا اور شریف منزل کو دلّی کے مظلوم اور بے سہارا لوگوں کے لیے جائے پناہ بنا دیا۔

چونکہ محمود خاں کے ریاستوں سے خوشگوار مراسم تھے اور انگریزوں کے دلّی پر قبضہ کے وقت ان ریاستوں کی فوجیں ان کے ساتھ تھیں۔ ریاست کے مہاراجگان نے انگریزوں سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ شریف منزل کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، بلکہ اسے تحفظ فراہم کریں گے۔ اس واقعہ سے حکیم غلام محمود خاں کے سیاسی اثر و رسوخ کا پتہ چلتا ہے۔

حکیم غلام محمود خاں نے مسند نشین ہونے کے بعد، مطب و معالجہ کے ساتھ خاندان کی

ایک اہم روایت، طبی تعلیم کے سلسلہ کو بھی جاری رکھا۔ دور دراز کے طلبہ، جو طب سیکھنے کی غرض سے اُن کے یہاں آتے، انہیں وہ خود بھی تعلیم دیتے، اس کے علاوہ اپنے بڑے بیٹے حکیم عبدالمجید خاں کو بھی انہیں پڑھانے کی ذمہ داری تفویض کر رکھی تھی۔

حکیم غلام محمود خاں نے طب کے تعلیمی نظام کو مربوط اور منظم کرنے کی سعی کی۔ قاضی عبدالغفار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ 'مدرسہ طبیہ' کا آغاز خود حکیم محمود خاں کے زمانہ میں ہوگیا تھا۔ حالانکہ تاریخی طور پر حکیم عبدالمجید خاں اس کے بانی خیال کیے جاتے ہیں۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ''حکیم عبدالمجید نے سب سے پہلے فن کے متعلق اپنے والد ماجد کے عزائم کو عملی صورت میں منتقل کیا۔ حکیم محمود خاں نے خود ہی اپنے درس کو جس میں طلبہ کسب فن کرتے تھے، ایک مدرسہ طبیہ کی صورت میں منتقل کر دیا تھا، لیکن عمر نے انہیں اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ اس مدرسہ کے استقلال اور استحکام کی تدبیر اختیار کر سکتے۔ یہ کام عبدالمجید خاں نے شروع کیا اور اجمل خاں نے اس کی تکمیل کی''۔

حکیم غلام محمود خاں، خاندانِ شریفی کے پہلے طبیب ہیں، جنہوں نے جنسی مسائل پر کھل کر بحث کی ہے اور طبی نقطۂ نظر کی روشنی میں انہیں پیش کیا ہے۔ جنسی مسائل اور طب کے باہیہ نظریات کے سلسلہ میں انہوں نے دو کتابیں، 'ضیاء الابصار فی حد الباہ' اور 'کارنامہ عشرت' تالیف کی تھیں۔

'ضیاء الابصار فی حد الباہ' ان کی بڑی مقبول کتاب ہے۔ اس کی متعدد فارسی اشاعتوں کے علاوہ اردو میں تین ترجمے کیے گئے ہیں۔ ایک ترجمہ 'زندگی کی بہار' اسٹار پریس دہلی سے 1927ء اور دوسرا ترجمہ 'لذتِ حسن وشباب' کے نام سے برقی پریس دہلی سے طبع ہوا ہے۔ تیسرا ترجمہ عبدالباری آسی کا ہے، یہ 'انوار الابصار' کے نام سے 1946ء میں مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

حکیم غلام محمود خاں کی ایک تالیف، قانون شریفی بھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک بڑا تصنیفی سرمایہ روزنامچہ ہے، جسے وہ اپنی حیات میں پابندی سے لکھتے رہے۔ ان کی وفات کے

بعد یہ روزنامچہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر خاندان کے افراد میں تقسیم ہوگیا اور اس کے جمع وترتیب اور اشاعت کی نوبت نہیں آسکی۔ اگر یہ شائع ہوگیا ہوتا تو نہایت بیش قیمت سرمایہ ہوتا۔

72 برس کی عمر میں 1309 ہجری مطابق 1892ء میں فالج کے عارضہ میں مبتلا ہوکر وفات پائی۔ سید حسن رسول نما قبرستان میں دفن کیے گئے۔

ان کی وفات پر مولانا حالی نے ایک دردناک مرثیہ لکھا تھا، اس میں انہوں نے محمود خاں کے کمال فن اور شخصیت کو نہایت موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ مرثیہ اردو ادب میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ یہ مرثیہ ایک رسالہ کی صورت میں مطبع انصاری، دہلی سے 1892ء میں طبع ہوا ہے۔ حکیم غلام محمود خاں کے کئی تذکرہ نگاروں نے اس مرثیہ کے اشعار اپنی تالیفات میں نقل کیے ہیں۔

حکیم غلام محمود خاں کے انتقال کے بعد ان کے تینوں صاحبزادے حکیم عبدالمجید خاں، حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں ان کے علمی وفنی ورثے کے امین ہوئے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ حیاتِ اجمل، قاضی محمد عبدالغفار، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1950ء

2۔ حیاتِ اجمل، شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں، عالمی اردو مرکز، دلی، اشاعت دوم 2002ء

3۔ حکیم اجمل خاں، کوثر چاند پوری، نظامی پریس، لکھنؤ، 1973ء

4 تذکرۃ الخواجگان، حکیم خواجہ احسان اللہ، شائع کردہ یونانی شفاخانہ، لشکر، 1941ء

5۔ دلّی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی دہلی، اشاعتِ ثانی 2011ء

6۔ خاندانِ شریفی، حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، 2001ء

حکیم عبدالمجید خاں

حکیم عبدالمجید خاں 1266 ہجری مطابق 1850ء میں پیدا ہوئے۔ جب 1857ء میں مغل حکومت کے سقوط کا سانحہ پیش آیا تو ان کی عمر محض سات برس کی تھی۔ اس انقلاب کا تعلق محض حکومت کی تبدیلی اور سابقہ دیرینہ حکومت کی جگہ ایک نئی حکومت کے تسلط سے نہیں، بلکہ اس سے لسانی، فنی اور تہذیبی اُمور بھی جڑے ہوئے تھے۔

1857ء کے اس واقعہ نے خصوصاً مسلمانوں کے خفتہ وجود کو جھنجھوڑا اور جب وہ بیدار ہوئے تو اپنے علمی ورثہ اور تہذیبی میراث کو مغرب کے تسلط میں پایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں بیدار مغز مسلم ذہنوں نے ملی اور تہذیبی باز آبادکاری کا جو نسخہ تجویز کیا تھا، اس میں تعلیم کو جزءِ اعظم کی حیثیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں اس سلسلے کی کئی تحریکیں وجود میں آئیں، مثلاً سرسید کی علی گڑھ تحریک اور مولانا قاسم نانوتوی کی دیوبند تحریک وغیرہ۔

حکیم عبدالمجید خاں نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو 1857ء کے بعد کے حالات ان کے سامنے تھے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم اور مذہبی تعلیم کے لیے منظم طور پر تحریکوں کا آغاز ہو چکا ہے، لیکن طبِ یونانی، جس کا تعلق مسلمانوں کی علمی اور تہذیبی میراث سے ہے، اس کے تحفظ کا اب تک کوئی جامع انتظام نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے طب کے تحفظ کے لیے تحریک شروع کی اور اس کے لیے عملی اقدامات کیے، یہی حکیم عبدالمجید خاں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

چونکہ حکیم عبدالمجید خاں کی شخصیت کی نشوونما اور ارتقاء کا زمانہ برطانوی تسلط کے بعد کا ہے اور ان کی شخصیت تسلط کے زمانہ میں پروان چڑھی ہے، لہٰذا اس پر اس عہد کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

حکیم عبدالمجید خاں نے درسیات کی تکمیل مولوی عبدالرحیم، مولانا محمد علی چاند پوری اور دوسرے علماء سے کی اور مولانا نذیر حسین محدث دہلوی سے حدیث پڑھی۔ اپنے چچا حکیم غلام مرتضیٰ خاں اور چچازاد بھائی حکیم غلام رضا خاں سے طب کی تعلیم حاصل کی، اپنے والد حکیم غلام محمود خاں سے مطب سیکھا اور بہت جلد طب کے علمی اور نظری شعبوں میں مہارت پیدا کرلی۔

حکیم عبدالمجید خاں نے اپنے والد کی زندگی ہی میں باقاعدہ مطب شروع کردیا تھا، حکیم غلام محمود خاں نے ان کے علمی ذوق کو دیکھتے ہوئے طلبہ کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی انہیں تفویض کردی تھی۔ وہ گھر پر طلبہ کو قانون، شرح اسباب، سدیدی اور نفیسی کا درس دیا کرتے تھے۔ حکیم عبدالمجید خاں کو درس وتدریس سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ کلیاتِ قانون کے درس میں وہ خاص امتیاز رکھتے تھے۔ صبح کو مطب سے فراغت کے بعد درس دیتے، پھر اس میں پیش آنے والے مشکل فنی مسائل اور طلبہ کے سوالات کے حل کے لیے پابندی سے کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔

اس عہد کی دوسری تعلیمی تحریکوں سے متاثر ہو کر حکیم عبدالمجید نے طبی تعلیم کے استاذی یا شخصی نظام کو ختم کرکے، اسے مدرسوں کے طرز پر رائج کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس کا احساس اُن کے والد حکیم غلام محمود خاں کو بھی تھا۔ انہوں نے طب کا مدرسہ قائم کرنے کا تہیہ بھی کیا تھا، مگر اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے تھے۔

معاصر تقاضوں کے تحت طبی نظامِ تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت سب سے پہلے حکیم عبدالمجید خاں نے محسوس کی، ورنہ اب تک طب کی تعلیم قدیم طرز پر ہو رہی تھی اور انفرادی طور پر درس کا سلسلہ تھا، جس میں طلبہ، اساتذہ سے کچھ کتابیں پڑھ کر ان کے مطبوں سے تشخیص وتجویز کی مشق کرکے طبیب بن جاتے تھے۔ تعلیم کے اس نظام میں درجات اور کلاسوں کا باقاعدہ کوئی دستور نہیں تھا، بلکہ کتابوں کے نام پر درجات کی تقسیم تھی۔ مثلاً 'جماعتِ کلیاتِ قانون اور جماعتِ شرحِ اسباب وغیرہ۔

حکیم عبدالمجید خاں نے جب 'مدرسہ طبیہ' کی شروعات کی تو انہوں نے جماعتوں کے قواعد وضوابط وضع کرکے الگ الگ سشن مقرر کیے۔ ابتداً دو جماعتیں مقرر کیں۔ ابتداءِ شوال سے آخرِ شعبان، جماعتوں کی میقات طے کی۔ فارسی اور عربی کی دو الگ جماعتیں قائم کیں۔ ابتداءً

مدت تعلیم دو سال تھی، پھر اسے بڑھا کر تین سال کر دیا اور نصاب میں علم تشریح کی کمی محسوس کرتے ہوئے 'شرحِ تشریح اعضاء مرکبہ' مصنفہ حکیم صادق علی خاں کو داخلِ نصاب کیا۔

غیر رسمی طور پر 1882ء ہی میں مدرسہ طبیہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب تک شریف منزل ہی درس گاہ کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ حکیم عبدالمجید خاں نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے مشورے اور حکیم جمیل الدین کے تعاون سے باقاعدہ 'مدرسہ طبیہ' کی بنیاد ڈالی اور دہلی کے ڈپٹی کمشنر آر کلارک کے ہاتھوں 23 جون 1889ء کو اس کا افتتاح عمل میں آیا، اس نئی شکل کے آغاز کے بعد شریف منزل میں رائج طبی اسکول گلی قاسم جان میں منتقل ہو گیا۔ اس مدرسہ میں حکیم عبدالمجید خاں اعلیٰ جماعت کے طلبہ کو درس دیتے تھے، حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں بھی تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ حکیم جمیل الدین کے ذمہ طب کی فارسی کتابیں تھیں۔

خاندانِ شریفی میں درس و تدریس کا سلسلہ بہت اوپر سے چلا آ رہا تھا، مگر حکیم عبدالمجید خاں سے پہلے طلبہ کو سند دینے کا رواج نہیں تھا۔ اُنہوں نے اِس کی رسم قائم کی، جو طلبہ ان سے طب کی تعلیم حاصل کرتے، وہ انہیں اپنے ہاتھ سے سند لکھ کر عطا کیا کرتے تھے۔

'مدرسہ طبیہ' کے قیام کے بعد اس کے انتظام و انصرام کے لیے ایک خاص فنڈ کی ضرورت تھی، حکیم عبدالمجید خاں نے اپنے اثر و رسوخ سے نواب رام پور اور دوسرے صاحبِ خیر حضرات سے تعاون حاصل کیا۔

حکیم عبدالمجید خاں کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے جدید طرز پر طبی تعلیم کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے عملی اقدامات اور اہتمامات کیے اور یونانی طب میں تعلیم کے ایک نئے دستور کا آغاز کیا۔

آج ہندوستان میں طبّی تعلیم کے سرکاری اور غیر سرکاری نوعیت کے بکثرت ادارے ہیں، مگر اس سلسلہ کے اصل بانی حکیم عبدالمجید خاں ہیں، انہی کی کوششوں سے علی گڑھ اور دیو بند کے طرز پر دلّی میں طبّی تعلیم کی تحریک کی شروعات ہوئی۔

حکیم عبدالمجید خاں نے اپنی اعلیٰ طبّی قابلیت اور حیرت انگیز معالجاتی صلاحیت سے دلّی میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہاں روسا، عمائدین اور مذہبی تفریق کے بغیر بڑے بڑے

ہندو، یہودی اور عیسائی ان سے رجوع کرتے تھے۔ یہاں کی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں اُنھیں نمایاں مقام حاصل تھا۔ ملا واحدی لکھتے ہیں:

''میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دلی میں بے تاج کا بادشاہ حکیم عبدالمجید خاں کو دیکھا''

1898ء میں حکیم عبدالمجید خاں کو فنی حذاقت اور اعلیٰ طبی صلاحیت کے اعتراف میں حاذق الملک کا خطاب عطا کیا گیا۔ اس موقع پر ان کے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسہ منعقد ہوا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے حکیم صاحب کی مدح میں ایک نظم لکھی تھی، جس کا ایک شعر ہے۔

ہوتی ہے یوں تو اَوروں کی عزت خطاب سے
لیکن ہوئی خطاب کو عزت، جناب سے

11 جولائی 1901ء کو ورم جگر کے عارضہ میں مبتلا ہو کر 53 برس کی عمر میں طبی تعلیم کا یہ مسیحا دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے دونوں بھائیوں حکیم محمد واصل خاں اور حکیم اجمل خاں نے ان کے ادھورے منصوبوں کی تکمیل کی۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ تذکرۂ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی، ناشر ناظم مشیر الاطباء و چشمۂ زندگی، لاہور، 1928ء

2۔ تذکرۃ الخواجگان، حکیم خواجہ احسان اللہ، شائع کردہ یونانی شفاخانہ لشکر، 1941ء

3۔ حکیم اجمل خاں، حکیم کوثر چاند پوری، نظامی پریس، لکھنؤ، 1973ء

4 دلی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی دہلی، اشاعت ثانی 2011ء

حکیم عبدالعزیز

حکیم عبدالعزیز ہندوستان کی طبی تاریخ میں نہایت گرامی منزلت ہیں، انہوں نے طب کے احیاء اور فروغ میں جو کردار ادا کیا ہے، اس سے واقعی طب کے مردہ تن میں حیاتِ نو پڑی ہے۔

حکیم عبدالعزیز 1855ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، وہ حکیم محمد یعقوب کے پوتے اور حکیم محمد اسماعیل کے بیٹے ہیں۔ ان کے خاندان میں طب کی روایت پہلے سے تھی۔ ان کے دادا حکیم محمد یعقوب ایک حاذق طبیب تھے اور تشخیص و معالجہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حکیم عبدالعزیز نے ان روایتوں کو اتنے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا کہ ان کا نام طب کی ایک علامت بن گیا اور خاندانِ عزیزی کے نام سے ایک اہم سلسلہ کا آغاز ہوا۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ حکیم عبدالعزیز نے مروجہ درسیات کی تکمیل محمد نعیم بن عبدالحکیم انصاری لکھنوی اور دوسرے اساتذہ سے کی۔ طب کی تعلیم اپنے جد امجد حکیم محمد یعقوب اور چچا حکیم ابراہیم سے حاصل کی۔

طبی تعلیم سے فراغت کے بعد حکیم عبدالعزیز نے مطب شروع کیا، ساتھ میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی۔ ان کے مطب میں مریضوں کے علاوہ طلبہ کا بھی ہجوم ہوتا تھا، جہاں ہندوستان کے علاوہ کابل، ہرات، بخارا اور حجاز جیسے دور دراز مقامات سے طب سیکھنے کی غرض سے طلبہ ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔

حکیم عبدالعزیز کو فنون نظری میں اتنا کمال حاصل تھا کہ ان کے معاصرین میں کوئی دوسرا طبیب اس امتیاز کا حامل نہیں تھا۔ خصوصاً کلیاتِ قانون کے درس میں وہ بے مثل سمجھے جاتے تھے۔ اس عہد کے اکابر علماء ان کے تبحر علم اور طریقِ درس کے ثناخواں تھے۔

حکیم عبدالعزیز اپنے عہد کے حاذق طبیب اور فلسفہ وحکمت میں کمال کا درجہ رکھتے تھے۔طب یونانی کے تمام فلسفیانہ مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے ایک مرتبہ ان کے درس اور طریقۂ تعلیم کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ طب اور فلسفہ کا گنجینہ ہے۔ مولانا عبدالحق خیر آبادی ان کے درس کو سننے کے بعد کہا کرتے تھے کہ حکیم عبدالعزیز ہندوستان کے فخر الاطباء اور تاج الحکماء ہیں۔

حکیم عبدالعزیز اور لکھنؤ کے دوسرے طبیبوں کے مطب اس عہد میں طبی اسکول کا درجہ رکھتے تھے اور طلبہ ان سے مستفید ہوتے تھے۔ مگر اس تعلیمی نظام کا دائرہ بہت محدود تھا اور نئے معاصر تقاضوں سے نمٹنے کے لیے ناکافی تھا، لہٰذا اسے مربوط اور منظم کرنے کی ضرورت تھی۔ خصوصاً 1857ء کے بعد کے حالات میں یونانی طب کا روایتی کردار بدلاؤ کا متقاضی ہوگیا تھا۔ ان تقاضوں کو خاندان شریفی نے پہلے ہی محسوس کر کے 'مدرسہ طبیہ' کی شکل میں تعلیم کی تنظیم کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس داعیہ کو محسوس کرتے ہوئے حکیم عبدالعزیز لکھنؤ میں طب کے تدریسی نظام کو باقاعدہ ایک مدرسہ کی شکل عطا کرنا چاہتے تھے۔ اسی دوران انہوں نے اپنے پیر و مرشد مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کو خواب میں دیکھا کہ وہ اسے شروع کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ حکیم عبدالعزیز نے اس خواب کے بعد مدرسہ کے قیام کا مصمم عزم کر لیا اور اپنے چھوٹے بھائی حکیم عبدالحفیظ، صاحبزادوں حکیم عبدالرشید و حکیم عبدالحمید، بھتیجوں حکیم عبدالمجید اور حکیم عبدالمعید کو جمع کیا اور خواب کے تذکرہ کے بعد فرمایا کہ اب میں طبی درس گاہ سے متعلق اپنے منصوبہ کو عملی شکل دینا چاہتا ہوں۔

گھر اور خاندان کے اطباء سے مشورہ کے بعد انہوں نے 2 مارچ 1902ء کو بغرض مشاورت ایک جلسہ کا اہتمام کیا، جس میں لکھنؤ کے مشاہیر، معززین اور تعلقہ دارانِ اودھ کو بلا کر طبی درس گاہ سے متعلق اپنے عزائم کی تفصیل بیان کی۔ حاضرین نے اُنہیں تعاون کا یقین دلایا۔ اس طرح جولائی 1902ء میں جھوائی ٹولہ میں مدرسہ تکمیل الطب قائم ہوا۔

چونکہ یہ مدرسہ فنی خدمت کے جذبہ سے قائم ہوا تھا اس لیے طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی، بلکہ جو طلبہ ذاتی اخراجات کے متحمل نہیں ہوتے، ان کی مزید اعانت کی جاتی۔ تکمیل الطب کے قیام کے وقت خاندان کے اطباء بلا معاوضہ استاذ مقرر ہوئے۔ خود حکیم عبدالعزیز کلیاتِ قانون،

حکیم عبدالحفیظ حمیاتِ قانون، حکیم عبدالرشید شرح اسباب جلد اول، حکیم عبدالمجید شرح اسباب جلد دوم، حکیم عبدالحمید نفیسی وکامل الصناعۃ مقالہ ثانیہ وتاسعہ، حکیم عبدالمعید قانونچہ، موجز واقسرائی پڑھاتے تھے، سالِ اول سے سالِ آخر تک کے تمام طلبہ کے لیے مطب کی حاضری ونسخہ نویسی کی مشق ضروری تھی۔

تکمیل الطب کا نصابِ تعلیم، قیام کے وقت تین سال کا تھا۔ اس میں وہ طلبہ داخلہ کے اہل تھے جو کم از کم منطق میں مُلّا حسن، فلسفہ میں میبذی اور ہیئت میں تصریح پڑھ چکے ہوں اور ان کے پاس کسی مدرسہ کی سند یا کسی استاذ کا تصدیق نامہ ہو۔

30 اکتوبر 1904ء کو تکمیل الطب کے فارغین کا پہلا بیچ نکلا۔ اس موقع پر ایک پروقار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ تقسیمِ اسناد کے اس جلسہ میں علامہ شبلی کی تقریر پروگرام کا خاص جزء تھی۔

تکمیل الطب کے قیام کے سلسلہ میں حکیم عبدالعزیز کے پیشِ نظر جو مقاصد تھے، ان میں طبّی تعلیم کی تنظیم کے ساتھ یہ مقصد بے حد اہم تھا کہ اس مدرسہ کے ذریعہ یونانی طبیبوں میں تشریح، سرجری اور کیمسٹری (علم الادویہ) جیسے متروک شعبوں کے احیاء اور فروغ کا اہتمام کیا جائے، اس لیے کہ انہوں نے طبِ یونانی میں ان مضامین کی کمی کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا، طب کی مروجہ تعلیم سے ان مضامین کی عدم موجودگی کو وہ فنِ طب میں ایک بڑا خلا سمجھتے تھے۔ لہٰذا تشریح، سرجری اور کیمسٹری کی تعلیم کو تکمیل الطب کے بنیادی مقاصد میں شامل کیا، تا کہ یہاں کے فارغین نبض کی شناخت اور نسخہ نویسی میں مہارت کے علاوہ ان مضامین میں درک وکمال حاصل کر کے اپنے اسلاف کا صحیح نمونہ بن سکیں۔

اس عہد میں حکیم عبدالعزیز کے ان تعلیمی نظریات کی مخالفتیں بھی ہوئیں، لیکن انہوں نے بڑی دلجمعی سے ان حالات کا سامنا کیا اور بزور استدلال مخالفت کرنے والوں کو مسکت جواب دیا۔

سرجری کے احیاء کے لیے انہوں نے یہ اقدام کیا کہ اپنے دوست ڈاکٹر کرنل جے اینڈرسن کے زیرِ نگرانی اپنے بیٹوں حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالحمید کی تعلیم کا بندوبست کیا تا کہ وہ سرجری کی باریکیاں سیکھ کر یونانی طلبہ کو اس کی تعلیم دے سکیں۔ کرنل اینڈرسن، جو لکھنؤ میں سول سرجن تھے،

ان کی نگرانی میں تکمیل الطب میں اعمالِ جراحی کو ترقی کا موقع ملا۔

حکیم عبدالعزیز کی کوششوں سے تکمیل الطب کے ذریعہ یونانی طب میں جدید تعلیمی تحریک کو بڑا فروغ ملا اور اس کے زیر اثر اطباء کی توجہ اس اہم ضرورت کی طرف مبذول ہوئی۔مطب، درس وتدریس اور تکمیل الطب کی انتظامی مصروفیات کے باوجود وہ تصنیف وتالیف سے بھی شغف رکھتے تھے۔درج ذیل کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

1۔ رسالہ تحفۂ عزیزی :

یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے، جو 1888ء میں مطبع نامی سے شائع ہوا ہے۔اس میں مرکبات کا مزاج نکالنے اور دوا کی کمیت میں اضافہ سے مرکب کے مزاج پر واقع ہونے والے اثرات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

2۔ غایۃ الاستحسان فی حسِ مخ الانسان:

حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم عبدالعزیز کے درمیان حس مخ دماغ پر ایک عرصہ تک مناقشہ ہوتا رہا۔اس رسالہ میں مؤلف نے حسِ جوہرِ دماغ کے خیال کی تردید کی ہے۔

3۔ رسالہ فی مبحث الطاعون:

یہ رسالہ طاعون کے بیان میں ہے۔حکیم عبدالعزیز نے اسے اپنے بیٹے حکیم عبدالرشید کے نام سے منسوب کیا ہے۔

4۔ بیاضِ مجربات:

یہ بیاض ابن سینا اکاڈمی کے ذخیرہ مخطوطات کی زینت ہے۔

5۔ حواشیِ قانون

حکیم عبدالعزیز نے قانون پر کچھ حواشی تحریر فرمائے تھے، یہ حواشی ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔

جمعہ کی شب، 19 شوال 1329 ہجری مطابق 13 اکتوبر 1911ء کو 57 برس کی عمر میں حکیم عبدالعزیز نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ نزہۃ الخواطر جلد 8، عبدالحئی حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، 1981ء

2۔ تذکرۂ خاندانِ عزیزی ، حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکاڈمی، علی گڑھ، 2009ء

3۔ جہانِ طب (تکمیل الطب کالج نمبر)، جلد 4، شمارہ 2-1، جولائی۔ دسمبر 2002ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

4۔ تذکرۂ اطباءِ اودھ ، حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، ادارۂ ادبیات دلی، 2008ء

5۔ تحفۂ عزیزی، حکیم محمد عبدالعزیز، مطبع نامی، لکھنؤ، 1304 ہجری

لکھنؤ مطب کا مطالعہ

ہندوستان کے تقریباً تمام علاقوں میں ایران اور سینٹرل ایشیا سے طبیبوں کی آمد کے حوالے ملتے ہیں۔ مگر دکن اور شمالی ریاستوں کی فضا مہاجر طبیبوں کو زیادہ راس آئی، یہی وجہ ہے کہ ان خطوں میں یونانی طب کا خاصا بول بالا رہا۔ حکمرانوں کی علم دوستی، عالم نوازی، فنی قدر افزائی اور سرپرستی، یہاں طب کے فروغ کی اہم وجہ بنی۔

شمالی ہندوستان میں لکھنؤ اور دلّی نے طب کی نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اپنے مخصوص فنی تفردات اور امتیازات کے باعث، ہندوستان کی طبی تاریخ میں دو مکتبۂ فکر اور اسکول کے بطور جگہ بنائی ہے۔

گو کہ لکھنؤ کی طبی شہرت میں یہاں کے کئی خانوادوں کا حصہ ہے، مگر خاندانِ عزیزی کو لکھنؤ کا نمائندہ خیال کیا جاتا ہے اور ان کا ذکر خاندانِ شریفی کے مقابلہ میں کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ طبی اسکول نے مفردات پر انحصار، مرکبات سے اجتناب، سمّی اور درجۂ چہارم کی دواؤں اور کشتوں سے احتراز اور مصنوعی تراکیب سے گریز کو شعار بنایا اور اپنے مطبوں میں ان امور کے التزام کا اہتمام کیا، نیز یونانی طب کو خالص شکل میں رکھنے کے لیے معاصر طبوں سے اختلاط کو یکسر مسترد کیا۔ ان سب خصوصیات میں علاج بالمفرد کا تصور 'لکھنؤ مطب' کا سب سے اہم امتیاز مانا جاتا ہے۔ اہل لکھنؤ کے اس فکری مسلک کا تذکرہ اس اسکول کے کئی واقف کاروں نے کیا ہے۔

'لکھنؤ مطب' کی اس خصوصیت کا بہر کیف اعتراف کرنا ہوگا کہ یونانی طب کے معالجہ میں تمام مبادیات اور فنی لوازموں کی رعایت علاج بالمفرد ہی سے ممکن ہے۔ یونانی فلسفہ کے مطابق خلطی تبدیلیاں مرض کی پیدائش کی اصل وجہ ہیں، مگر ان تبدیلیوں کے بہت سے دوسرے

محرکات بھی ہیں۔ چنانچہ مریض کے بدن اور اس کے مزاج کے ساتھ، موسمی مزاج اور ماحولیات وغیرہ بھی مرض کی پیدائش کے محرک ہیں۔ لہٰذا معالجہ کے وقت صرف مرض اور مریض کو مرکز توجہ بنانے کے بجائے مرض اور مریض کے مزاج، درجاتِ مرض اور موسمی حالات جیسے عوامل کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ ان تمام کوششوں کا مقصد محفوظ اور مؤثر طریقہ سے دواؤں کا استعمال ہے اور اس کا التزام علاج بالمفرد کی صورت ہی میں ممکن ہے۔

'لکھنؤ مطب' کی ان خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ جب عصری تناظر میں اس کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اہل لکھنؤ نے جس طرح کے مطب کو برتا ہے اور جس کی تبلیغ وتشہیر کی ہے، وہ ان کے فنی اخلاص کا مظہر ہے، مگر ان کی اس روش میں یک گونہ عصری داعیوں سے انحراف اور فنی تغافل محسوس ہوتا ہے۔

علاج بالمفرد یونانی طب کا مستحسن طریقۂ علاج ضرور ہے، مگر حتمی ضابطہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی معالجہ میں مرکبات کا ہر دور میں استعمال ملتا ہے اور یونانی طب کے ہر عہد میں مرکب دواؤں کو ایک اہم معالجاتی جزء کے طور پر برتا گیا ہے۔ مطب کا یہی انداز خاندان شریفی اور دلی کے دوسرے خانوادوں میں دیکھنے کو ملتا ہے اور ہندستان میں دوسرے طبیبوں کے یہاں بھی مرکبات کے استعمال کی روایت ملتی ہے۔ مگر دلی اور اس سلسلہ کے دوسرے طبیبوں کے یہاں مرکبات کے غلبۂ استعمال کی وجہ سے انہیں علاج بالمرکب کا حامی قرار دیا جاتا ہے۔

دواؤں کے محفوظ اور مؤثر استعمال کے لیے یونانی طبیبوں نے جو ضوابط طے کیے ہیں۔ بلاشبہ یونانی طب کے مؤثر اور بے خطر ہونے میں ان کا اہم کردار ہے اور ان اصولوں کی صدفی صد رعایت علاج بالمفرد سے ہی ممکن ہے، جو اہل لکھنؤ کے یہاں ملتی ہے، مگر علاج بالمفرد کو حتمی ضابطے کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ معالجہ کے وقت بہت سے ایسے داعیے سامنے آتے ہیں، جہاں مفردات کا التزام ممکن نہیں ہوتا۔ غالباً انہیں دشواریوں کی وجہ سے مرکبات کو معالجہ کا ایک ناگزیر حصہ مانا گیا۔ خود بقراط کے عہد میں علاج بالمرکب کی روایت ملتی ہے اور جالینوس، جو بقراطی نظریات کا شارح اور مبلغ ہے، نے مرکب دواؤں پر 'کتاب فی ترکیب الادویہ' کے نام سے ایک قرابادین تالیف کی تھی۔

جالینوس کی قرابادین کے یہ دونوں حصے 'کتاب قاطا جانس' اور 'کتاب المیامر' عربی عہد کے طبیبوں کا ماخذ اور مرجع رہے ہیں۔ عربی عہد میں مرکبات کی معالجاتی اہمیت کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ترکیبِ ادویہ، مرکبات میں اضافہ اور ان کی اصلاح اور اشکالِ ادویہ میں بہتری کے لیے عربوں نے شدتِ اعتنا کے ساتھ کوششیں کی ہیں اور اس میدان میں اُن کے اضافات کو اس عہد میں تالیف دی گئی کناشوں اور قرابادینوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

لکھنؤ اور دلی اسکول کے مطبوں کو دیکھنے کے بعد ذہن میں ایک سوال یہ آتا ہے کہ ان دو مختلف نظریاتی دھاروں کے بیچ میں موجودہ یونانی طب کے کیا خطوط ہوں؟ اور کس اسکول کی تقلید کو موجودہ طب کا مسلک قرار دیا جائے؟ یہ سوال ہمارے غور و فکر کا متقاضی ہے اور دراصل یہی سوال اس عنوان کا محرک ہے۔ یہ مسئلہ محض کسی ایک روش کی تقلید کا نہیں، بلکہ اس سے عصری معالجاتی تقاضے اور یونانی طب کے فروغ کے امکانات بھی وابستہ ہیں۔

یہ ایک تلخ سچائی ہے کہ یونانی طب زمانہ کی رفتار سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اس کی وجوہ پر غور کرنے سے اس واقعہ کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یونانی طب کے نظریات اور طب میں تحقیق کی کمی، اس کی پسماندگی کا باعث ہے۔ یقیناً یہ دونوں باتیں اپنی جگہ اہم ہیں اور کسی نہ کسی حد تک یہ اسباب طب کی رفتار ترقی میں مزاحم ہوئے ہیں، مگر یونانی طب کے پچھڑے پن کا اصل سبب روایتی دواسازی ہے۔ اس کے برعکس ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کو دوسری طبوں کے مقابلہ میں جو عوامی مقبولیت حاصل ہے، اس میں ان کی فارمیسی کا سب سے اہم حصہ ہے۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کی صورت میں صحت و مرض کے دو الگ نظریے سامنے آئے اور ان دونوں نے عوامی پذیرائی حاصل کی۔ دراصل ان طبوں نے دواسازی کا جو ڈھانچہ بنایا تھا، وہ موثر ہونے کے ساتھ سہل الاستعمال بھی تھا۔ یہ خوبیاں عوام کو اس قدر پسند آئیں کہ صدیوں سے رائج علاجی طریقوں اور ان کی دواؤں پر عوام نے ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کی دواؤں کو فوقیت دی۔ اگر فنی نظریے اہمیت کے حامل ہوتے تو کسی ایک کا فروغ ہونا چاہیے تھا، مگر مذکورہ دونوں ہی علاجی طریقوں کی پذیرائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مریض کو نظریات سے سروکار کے بجائے دواؤں کی اثر پذیری اور استعمال کی سہولت سے غرض ہوتی ہے۔

یونانی دواؤں کی اثر پذیری ایک محقق امر ہے۔صدیوں کے استعمال اور مسلسل تجربوں سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔مگر یونانی دواؤں کی مقدارِ خوراک، ترکیبِ استعمال، اشکال اور ذائقے وغیرہ ایسے مسائل ہیں، جو اس کی قبولیت کی راہ میں حائل ہیں۔لہٰذا یونانی طب کے فروغ اور اسے مقبولِ عام بنانے کی سمت میں دوا سازی کا شعبہ سب سے زیادہ توجہ طلب اور اصلاح کا متقاضی ہے۔

لیکن لکھنؤ کے طبیبوں نے مطب کا جو ڈھانچہ وضع کیا تھا، اس میں اصلاح کی باتیں تو دور، سرے سے دوا سازی کا اِمکان ہی مسترد ہو جاتا ہے۔حالانکہ دوا سازی کی اہمیت اور معاصر تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے عربوں نے ایک ہزار سال پہلے دوا سازی میں اصلاح کا عمل شروع کر دیا تھا۔یونانی دواؤں کے خدوخال کی بہتری کے لیے عربوں نے نہ صرف علم کیمیا سے دوا سازی کا رشتہ استوار کیا، بلکہ ان کی کوششوں سے علم کیمیا کی ایک نئی شاخ، فارماسیوٹیکل کیمسٹری وجود میں آئی۔لہٰذا یہ مقامِ حیرت ہے کہ یونانی طب میں دوا سازی اور مرکبات کی مستحکم روایت کے باوجود اہلِ لکھنؤ نے صرف جزوی دوا سازی پر انحصار کیوں کیا؟۔

چونکہ جزوی دواسازی میں اصلاح کا امکان نہیں کے برابر ہے، لہٰذا اطبائے لکھنؤ کا دواسازی کے تعلق سے یہ رویہ اسلاف کی روش سے انحراف اور یونانی طب کے فروغ میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔چونکہ لکھنؤ کا مطب جزوی دواسازی پر منحصر ہے اور ان دواؤں کے استعمال میں جو تکلفات ہیں، اسے آج سے سو دو سو برس پہلے تو برتا جا سکتا تھا، مگر آج کے اس مصروف دور میں ان تکلفات کو مریض انگیز نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یونانی دواؤں کے سہل الاستعمال بنانے پر خاص توجہ ہونی چاہیے۔یونانی طب میں رائج کلی دوا سازی بھی عصری داعیوں کی تکمیل کے باب میں ناکافی معلوم ہوتی ہے، لہٰذا یونانی طب کے اس پورے شعبہ کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کی اشد ضرورت ہے۔

نباتی اور حیوانی دواؤں کے ساتھ معدنی ادویہ طبی ذخیرہ کا اہم سرمایہ ہیں اور قدیم ترین زمانہ سے یونانی طب میں اس ماخذ کی دوائیں رائج رہی ہیں۔دیسقوریدوس کی 'کتاب الحشائش' اور جالینوس کی 'ادویہ مفردہ' سے یونانی طب میں تینوں ماخذ (نباتی، حیوانی اور معدنی) کے چلن کا

ثبوت ملتا ہے، نیز عربی اور ہندی عہد میں یہ تینوں ماخذ مطب کے معمولات میں شامل رہے ہیں۔
مگر لکھنؤ کے مطب میں معدنی ماخذ کی ادویہ برائے نام نظر آتی ہیں، اسی طرح درجہ سوم اور چہارم کی دواؤں کے باب میں اہل لکھنؤ نے احتیاط کا جو رویہ اپنایا ہے، مضرتوں سے تحفظ کے نکتہ سے یہ ایک بہتر روش معلوم ہوتی ہے، مگر اس سے سریع التاثیر دواؤں کی کمی جو یونانی طب میں ہمیشہ محسوس کی گئی ہے، ان دواؤں کے ترکِ استعمال کے بعد یہ کمی شدید تر ہو جائے گی۔ اہل لکھنؤ کے مطب میں ان دواؤں کا کیا متبادل ہوگا؟ اور وہ کس طرح ایسی ضرورتوں کا تدارک کریں گے؟۔
اس سوال کے جواب میں لکھنؤ کا مطب خاموش نظر آتا ہے۔

بیاضِ وحیدی کے مقدمہ میں حکیم سید ظل الرحمٰن نے 'لکھنؤ مطب' کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "قدماء کے انداز کے مطابق سمی ادویہ سے احتراز اطبائے لکھنؤ کی خاص خصوصیت تھی، بیاض وحیدی جو مختلف امراض کے کئی سو نسخوں پر مشتمل ہے اس میں شنگرف، پارہ، رسکپور، سنکھیا، بچھناک، ہڑتال، بھلاواں، افیون جیسی ادویہ کے استعمال کی کمی صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اطبائے لکھنؤ کی یہ خصوصیت بے حد اہم ہے کہ ان کے یہاں معدنی ادویہ پر نباتی اور حیوانی ادویہ کو ہمیشہ ترجیح دی گئی ہے، معدنی دوائیں جسم کے لیے زیادہ متغائر ہوتی ہیں، ان سے احتیاط بڑی دانشمندی اور فنی مطالعہ کا آئینہ دار ہے...... معدنی ادویہ کی طرح کشتہ اور اکسیر نے لکھنؤ میں فروغ نہیں پایا اور اسے نہ صرف حذاقت، بلکہ فنی اصولوں کے منافی سمجھا گیا۔ لکھنؤ جہاں اصول فن اور قدیم طبی نظریات پر خاص زور رہا وہاں آیورویدک اور پھر ایلوپیتھی سے طب کے اختلاط کو فن کے لیے نہایت ضرر رساں قرار دیتے ہوئے مختلف میدانوں میں اس کی مخالفت کی گئی، کشتہ سازی میں اس کا نمایاں اثر موجود ہے"۔

بیاضِ وحیدی کے اس اقتباس میں حکیم سید ظل الرحمٰن نے جن چیزوں کو اہل لکھنؤ کا امتیاز قرار دیا ہے، اصلاً یہ سارے پہلو طب کی نشو و نما اور فروغ کے تناظر میں لکھنؤ مطب کے وہ

نقائص ہیں، جن کے ازالہ کی اشد ضرورت ہے۔ قدیم طبیبوں کے یہاں معدنی ادویہ سے احتراز کے بجائے، ان کے باب میں احتیاط کا رویہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دواؤں کو یونانی طب میں مختلف تدبیروں سے اصلاح کے بعد استعمال کی روایت ہے اور یونانی دواسازی کی کتابوں میں دواؤں کی اصلاح وتدبیر، علم الصید لہ کا ایک مستقل عنوان ہے۔

حکیم سید ظل الرحمٰن کے محولہ اقتباس کے مطابق کشتوں اور اکسیر سے اجتناب کو اہل لکھنؤ حذاقت اور فنی اصول سمجھتے ہیں۔ احتیاط کے پہلو سے ان کے اس رویہ کو جائز کہا جاسکتا ہے، لیکن ان دواؤں کا اہل لکھنؤ کے یہاں کیا متبادل ہوگا؟ ، اسے بھی سامنے لائے جانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ محض محتاط رویوں سے ازالۂ مرض کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، بلکہ بہت سی پیچیدہ مرضی صورتوں میں سم الفار جیسی مہلک چیزوں کو عہدِ قدیم سے استعمال کیا گیا ہے اور ازالۂ مرض کے لیے سخت سے سخت تدابیر کو بھی برتا گیا ہے۔ اس وقت جب کہ مخدرات اور مسکنات دستیاب نہیں تھے۔ اطباء نے ضرورت پڑنے پر اعضاء کے قطع وبرید اور عمل کئی بالنار جیسے سخت ترین اعمال کا استعمال کیا۔ اس لیے محض احتیاط کے نام پر اہم معالجاتی ضرورتوں سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا اور نہ اسے مستحسن کہا جاسکتا ہے۔

آٹھویں صدی ہجری میں بیت الحکمت کے قیام کے بعد متعدد ویدک کتابوں کے عربی زبان میں ترجمے ہوئے۔ اُس عہد کے طبیبوں نے ان سے استفادہ کرتے ہوئے یونانی سرمایہ کو وسعت بخشی ہے۔ ربن طبری، رازی، مجوسی، مسیحی اور ابن سینا کی کتابوں میں ویدک حوالوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اَخذ وقبول کی صلاحیت یونانی طب کا ایک اہم امتیاز رہا ہے اور معاصر علوم سے اَخذ واستفادہ کے ذریعہ یونانی طب کے ذخیرۂ ادویہ میں بہت سے اہم اضافے ہوئے ہیں۔ اہل لکھنؤ دوسرے طبوں سے استفادہ کو غلط کیوں سمجھتے ہیں؟ اور اس عمل کو فن میں آمیزش سمجھ کر اَخذ وقبول کے دروازے کو بند کر کے فنی اضافے کو روکنے کے درپے کیوں ہیں؟ ان کا یہ طرزِ فکر ناقابل فہم اور اسلاف کی روایتوں کے منافی ہے۔

مختلف عمر کے لوگوں میں بچوں کے صحتی مسئلوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ دوسری عمر کے مسئلوں سے تھوڑی دیر کے لیے صرفِ نظر ممکن ہے، مگر بچوں کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کے

لیے فوراً معالج سے رجوع کیا جاتا ہے۔ بچوں کی مخصوص معالجاتی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایلو پیتھی فارمیسی نے دواؤں کو ایسی شکلوں میں پیش کیا ہے، جنہیں وہ بآسانی استعمال کر سکیں۔ اس کے برعکس یونانی طب کا یہ المیہ ہے کہ اس کی فارمیسی تین ہزار سال پرانی ہونے کے باوجود بچوں کے معالجاتی سامان سے بالکل خالی ہے۔ خود عوام بھی اس بات کو محسوس کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یونانی مطبوں میں مریض بچوں کی آمد کی شرح حیرت انگیز طور پر کم ہے اور یہ یونانی ذخیرۂ ادویہ کی کم مائیگی ہے کہ یونانی کے ہزاروں مرکبات میں بمشکل چند ایسے مرکب ہیں، جنہیں بچوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ صورتِ حال علاج بالمرکب کے مبلغ مطبوں کی ہے تو مفردات کے نظریہ کے حاملین سے ان ضرورتوں کی تکمیل کی توقع ہی عبث ہے۔

مطبِ مرتعش، بیاضِ وحیدی اور تذکرۂ خاندان عزیزی، لکھنؤ مطب کو سمجھنے کے اہم ذرائع ہیں۔ خصوصاً اوّل الذکر دونوں کتابیں اس باب میں بنیادی مأخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اہل لکھنؤ کی نسخہ نویسی میں تفنن اور جدت طرازی کا پتہ تو چلتا ہے، لیکن بچوں کی ضرورت کا کوئی سامان یہاں نہیں نظر آتا۔ بیاضِ وحیدی بچوں کے نسخوں سے بالکل خالی ہے اور مطبِ مرتعش میں امراضِ اطفال کا بیان صرف ساڑھے تین صفحوں پر محدود ہے۔ یہ تلخ واقعہ لکھنؤ مطب کا بہت بڑا فنی المیہ ہے اور کم وبیش یہی صورتِ حال دلّی مطب کی بھی ہے۔ اس لیے یونانی فارمیسی کا شعبہ جو پہلے ہی سے تحقیق اور توجہ کا مستحق تھا، مزید توجہ طلب ہو جاتا ہے۔

طب کے ہندی عہد میں یونانی ادویاتی ذخیرہ میں جو اضافہ ہوا ہے، وہ اس عہد کا ایک بڑا امتیاز ہے۔ ہندوستان میں تصنیف وتالیف کا جو کام انجام پایا ہے، اس کا بیشتر حصہ مفرد اور مرکب دواؤں سے متعلق ہے اور اس کام میں دلّی سلسلہ کے طبیبوں کا اہم کردار ہے۔ اس کے بالمقابل لکھنؤ کے طبیبوں کا تصنیف وتالیف میں کم حصہ رہا ہے، جس کی بڑی وجہ معاصر طبوں سے عدم استفادہ اور قرابادینی نظام کا فقدان ہے۔ لکھنؤ میں خاندانِ عزیزی، طبیبوں کا نمائندہ گھرانہ ہے، خود ان کے یہاں بھی تصنیف وتالیف کی روایت بہت زیادہ نہیں رہی۔ اس کی علت بیان کرتے ہوئے حکیم سید ظل الرحمان لکھتے ہیں:

"اراکین خاندانِ عزیزی کا مطب اور درس سے شغف وانہماک زیادہ رہا اور

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گزشتہ پونے دوسو برس میں اس خاندان کے فیض سے سیکڑوں نامور اطباء پیدا ہوئے اور ان کے معالجہ کے ذریعہ لاکھوں انسانوں نے جامِ صحت نوش کیا، لیکن مطب اور درس میں مصروفیت اور وقت گزرنے کی وجہ سے تصنیف و تالیف کے لیے انہیں زیادہ موقع نہیں مل سکا، اس میں غالباً لکھنؤ کے مخصوص ماحول کا بھی دخل تھا۔ دہلی کے برخلاف لکھنؤ کی خاموش فضا اور پرسکون زندگی جہاں مسابقت اور سرگرمیاں کبھی اتنی تیز نہیں رہیں، جہاں قناعت و عزلت اور گوشہ نشینی علماء و صوفیاء اور مشائخین سے لے کر اطبّاء میں اپنا اثر کرتی رہی"۔

حکیم سید ظل الرحمٰن کو لکھنؤ، خصوصاً خاندان عزیزی سے بے انتہا عقیدت و تعلق ہے۔ اس لیے اُنہوں نے یہاں کے طبیبوں کے ضعفِ قلم کو، جس کا اصل محرک وہاں کا طرزِ مطب اور مخصوص فنی فکر ہے، کے بجائے لکھنؤ کے پُرسکون ماحول کو ذمہ دار مانا ہے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ علمی، تصنیفی اور تالیفی کاموں کے لیے پُرسکون ماحول زیادہ سازگار ہوتا ہے۔ اس لیے لکھنؤ میں تصنیفی اور تالیفی کاموں کی کمی کا موجب وہاں کا ماحول نہیں، بلکہ طبیبوں کا فن کے باب میں مخصوص زاویۂ فکر اور مطب کا انداز ہے۔

لکھنؤ کے مطبوں کا مطالعہ کرتے وقت وہاں کی نسخہ نویسی میں لکھنؤ کی معاشرت اور تہذیب کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ لکھنؤ کی زندگی کے تمام شعبے، چاہے ان کا تعلق معاشرت سے ہو یا علوم و فنون سے یا لسانیات و ادبیات اور تہذیبی اقدار سے، ان سب میں لطافت اور تفنن کے نقوش نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں اور یہ اثرات وہاں کے مطبوں اور نسخہ نویسی میں بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً بیاضِ وحیدی میں صرف صداع کے سو سے زیادہ نسخے تحریر ہیں، جو نسخوں میں تفنن کی ایک عمدہ مثال ہے۔ لکھنؤ کے مطبوں کے مطالعہ کے وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہاں لسانیات و ادبیات کی طرح لطافت و نفاست پر زیادہ توجہ کے باعث بہت سے ضروری فنی امور اور عصری داعیے بے اعتنائی کا شکار ہو گئے۔

لکھنؤ نے جس زمانے میں ایک طبی اسکول کا مرتبہ حاصل کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب حلقۂ عوام میں مغربی طب کے اثر و رسوخ بڑھ رہے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں یونانی اور دوسری روایتی طبیں

مغرب کا ہدف بنی ہوئی تھیں۔ اس پُر آشوب دور میں لکھنؤ اسکول نہ صرف وقت کی نزاکتوں سے بے پروا ہو کر محض کورانہ روش کی تقلید کو اپنا شعار بنائے رہا، بلکہ دلی اسکول کی اصلاحی کاوشوں کی انتہائی شدومد کے ساتھ مخالفت کی اور فنی اصلاح کے عمل میں مزاحم ہوا۔

مذکورہ سطور میں 'لکھنؤ مطب' کے عنوان سے لکھنؤ کے طرزِ مطب کا عصری تناظر میں جائزہ لینے کے ساتھ ارتجالاً دلی مطب کو پیش کرتے ہوئے ان دونوں اسکولوں میں رائج مطبوں کا تقابل اور موجودہ معالجاتی تقاضوں کی روشنی میں طب کے تشنہ پہلوؤں اور اصلاح طلب گوشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ نقد و تجزیہ کی اس کوشش میں اندازِ بیان قدرے درشت اور لہجہ کسی حد تک سخت لگے اور بعض تجزیاتی پہلو ناگوارِ خاطر محسوس ہوں، لیکن اکثر اصلاح کے عمل میں ذہنوں کو صدمات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ان صدمات کو انگیز کیے بغیر تقلید اور روایت کے دائروں سے نہیں نکلا جا سکتا۔ لہٰذا فنی اصلاح کے لیے نقد و تجزیہ کی تلخیوں کو ایک لازمی دستور سمجھ کر انگیز کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر اصلاح کا عمل انجام نہیں پا سکتا۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ عیون الانباء فی طبقات الاطباء، جلد اوّل، ابن ابی اصیبعہ (اردو ترجمہ) سی سی آر یو ایم، نئی دہلی، 1990ء

2۔ بیاضِ وحیدی، حکیم سید ظل الرحمان، طبی اکاڈمی، تجارہ ہاؤس، علی گڑھ، اشاعتِ دوم 1991ء

3۔ مطبِ مرتعش، حکیم سید ظل الرحمان، طباعت لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ، 1976ء

4۔ بیت الحکمت کی طبی خدمات، حکیم وسیم احمد اعظمی، محبوب پریس، دیوبند، طبع دوم 1989ء

5۔ جہانِ طب (حکیم افتخار الحق تکمیلی نمبر)، جلد 7، شمارہ 3، جنوری تا مارچ 2006ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

6۔ کتاب الحشائش، تعارف و تجزیہ، ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن، مرکز تحقیقات اسلامی پٹنہ، 2007ء

7۔ طب العرب، ترجمہ و تشریح حکیم سید علی احمد نیر واسطی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، 1954ء

حکیم محمد حسین رضا خاں

حکیم محمد حسین رضا خاں لکھنؤ کے اہم طبی خانوادہ 'خاندانِ رضا' کے مشہور طبیب ہیں۔ حکیم حاجی علی رضا خاں اس خاندان کے بانی ہیں، جو کشمیر سے ہجرت کر کے لکھنؤ کے جھوائی ٹولہ میں فروکش ہوئے تھے۔ اُن کے ذریعہ یہاں طب کا ایک بہت ہی اہم سلسلہ شروع ہوا، مگر طبی خانوادوں کے تذکروں میں 'رضا خانی' طبیبوں کا ذکر بہت کم ہوتا ہے اور بالعموم لکھنؤ کی طبی تاریخ کو خاندانِ عزیزی پر ختم سمجھ لیا جاتا ہے۔

'رضا خاندان' سے تعلق رکھنے والے طبیبوں میں حکیم محمد حسین رضا کا نام بہت اہم ہے۔ وہ 1859ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے اہم اساتذہ میں مولانا عبدالحق خیرآبادی اور مولانا عبدالعلی خاں رامپوری کے نام شامل ہیں۔ طب کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، ذہانت اور شوقِ مطالعہ کے باعث بہت جلد اس میں مہارت پیدا کر لی۔

حکیم محمد حسین رضا خاں کو مطالعہ سے بے حد دلچسپی تھی۔ اُن کا بیشتر وقت کتب بینی میں صرف ہوتا تھا۔ اُن کے اندر درس وتدریس کی صلاحیت بہت اچھی تھی۔ اُنہیں طلبہ کو مطمئن کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ آتا تھا۔ وہ مطب و معالجہ میں نہایت غور وخوض کے عادی تھے۔ تجویزِ نسخہ کے سلسلہ میں صرف مرض کے احوال سننے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ نسخہ اس وقت تجویز کرتے جب خود نبض اور قارورہ کا معائنہ کر لیتے۔

طبی تعلیم سے فراغت کے بعد حکیم محمد حسین رضا خاں رامپور چلے گئے اور وہاں تقریباً اکیس برس تک خدمات انجام دیں۔ والیٔ ریاست نواب محمد کلب علی خاں کے عہد میں وہ ریاست کے تمام شفاخانوں کے اعلیٰ افسر رہے۔ پھر اُن کے بعد نواب محمد اشفاق علی کے زمانہ میں طبیبِ خاص

رہے اور جب نواب حامد علی خاں سریر آرائے ریاست ہوئے تو ان کے زمانہ میں بھی حکیم صاحب طبیب اور مصاحبِ خاص رہے۔

رامپور کے زمانہ قیام میں حکیم محمد حسین رضا خاں، ریاست کے طبّی اُمور کی نگرانی اور والیانِ ریاست کے معالج خصوصی کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ صدر شفا خانہ میں طبیب کی حیثیت سے بیٹھتے تھے۔ ساتھ ہی شائقین طب کو درس بھی دیتے تھے۔ یہاں طلبہ کی ایک کثیر جماعت نے اُن سے طب کی تعلیم حاصل کی۔

1902ء میں ریاست کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنے وطن لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں اُنہوں نے مطب اور درس کا سلسلہ شروع کیا اور کثیر تعداد میں طلبہ ان سے مستفید ہوئے۔ طب کی تعلیم کو منظم کرنے کے لیے اُنہوں نے 1902ء میں 'منبع الطب' کے نام سے ایک طبّی درس گاہ قائم کی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ درس گاہ 1904ء میں شروع ہوئی تھی، لیکن اس درس گاہ سے فارغ کچھ طلبہ کی سند پر 1904ء کی تاریخ رقم ہے۔ اس لیے اس کے قیام کا صحیح سنہ 1902ء ہی ہے۔ 1909ء تک حکیم محمد حسین رضا خاں اس کے سرپرست رہے۔

یکم ربیع الاول 1327ھ مطابق 24 مارچ 1909ء کو رامپور ہی میں حکیم محمد حسین رضا خاں کا انتقال ہوا اور یہیں میاں محمد عاشق کے مزار میں دفن ہوئے۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے حکیم ہادی رضا خاں نے منبع الطب کو فروغ دیا۔ وہ اس کالج میں پرنسپل اور آنریری سکریٹری رہے۔ 1943ء میں حکیم عبدالحلیم 'منبع الطب' کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اُن کی کوششوں سے 'مدرسہ وہاجیہ' کو 'منبع الطب' میں ضم کر دیا گیا، تاکہ ان دونوں کو ملا کر ایک بڑے ادارہ کی شکل دے دی جائے۔ حکیم عبدالحلیم 1951ء میں متحدہ منبع الطب کے بند ہونے تک اس کے پرنسپل رہے۔ 'منبع الطب' سے تقریباً 1500 طلبہ فارغ ہوئے، جنہوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں طب کی خدمات انجام دیں۔

مطب و معالجہ اور درس و تدریس کے ساتھ حکیم محمد حسین رضا خاں کو تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ 'تحفۂ حسینی' اُن کی ایک مطبوعہ کتاب ہے۔ انہوں نے ایک قلمی بیاض لکھی تھی، جس میں حکیم احمد رضا، حکیم حسن رضا، حکیم محمد ابراہیم اور خاندان کے دوسرے اطباء کے معمولات و مجربات

درج ہیں۔اس بیاض میں شامل نسخے قلیل الاجزاء، سہل الحصول اور سریع التاثیر ہیں۔نسخوں کے ساتھ اِن کی تیاری کا طریقہ بھی درج ہے۔

بیاض کے اختتام پر حکیم محمد حسین رضا کا دستخط اور 1907ء کا سنہ درج ہے۔یہ بیاض فارسی زبان میں ہے۔اس کے مطالعہ سے خاندان عزیزی کے علاوہ ایک اور اہم طبی خانوادہ کے منہج علاج پر روشنی پڑتی ہے۔

مطالعاتی ماخذ

1۔ جہانِ طب (تکمیل الطب کالج نمبر)، جلد4، شمارہ2-1، جولائی۔دسمبر2002ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

2۔ تذکرۂ اطباءِ اودھ ،حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، ادارۂ ادبیات دلی، 2008ء

3۔ تذکرۂ خاندانِ عزیزی، حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعت ثانی 2009ء

4۔ تذکرہ کاملانِ رام پور، احمد علی خاں شوق، ہمدرد پریس دہلی، مارچ 1929ء

حکیم نجم الغنی رامپوری

حکیم نجم الغنی بن عبدالغنی بن عبدالعلی بن عبدالرحمٰن بن محمد سعید رام پوری کا شمار انیسویں صدی کی ممتاز علمی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ 1276 ہجری مطابق 1859ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ریاست اُودے پور میں ملازم تھے، لہٰذا انہیں کے ساتھ اُودے پور چلے گئے تھے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اِس کے بعد وہ رام پور آ گئے اور یہاں مولوی ظہور حسین، شیخ ارشاد حسین، علامہ عبدالحق بن فضل حق خیر آبادی سے کتبِ درسیہ کی تحصیل کی۔ حدیث کی تعلیم سید حسن شاہ اور سید محمد شاہ سے حاصل کی۔ فنونِ ادبیہ کی تعلیم شیخ محمد طیب بن محمد صالح کاتب مکی سے پائی۔ طب کی تعلیم اپنے ماموں حکیم محمد اعظم خاں رام پوری سے حاصل کی، جن کا شمار اپنے عہد کے حاذق اور کثیر التصنیف طبیبوں میں ہوتا ہے۔ اُن کے علاوہ حکیم محمد حسین رضا خاں لکھنوی اور حکیم احمد رضا سے بھی طب کی تحصیل کی۔

حکیم نجم الغنی بڑی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں عربی، فارسی اور اردو پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اِن تینوں زبانوں میں اُنہوں نے تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ بیک وقت مورخ، ادیب، لغت نویس اور ماہرِ منطق و فلسفہ تھے۔ اُنہوں نے علمِ کلام، فقہ و اصول فقہ، طب اور تصوف جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔

حکیم نجم الغنی کی تصانیف کی کثرت اور موضوعاتی تنوع سے علمی ہمہ جہتی اور بلند رتبہ کا پتہ چلتا ہے۔ اُنہوں نے مختلف موضوعات پر جو ورثہ یادگار چھوڑا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1۔ اخبار الصنادید: آٹھ سو سے زائد صفحات پر محیط یہ کتاب روہیل کھنڈ کے پٹھانوں کی تاریخ پر

مشتمل ہے۔ یہ رضا لائبریری، رام پور سے 1997ء میں شائع ہوئی ہے۔

2۔ بحر الفصاحت: یہ علمِ معانی، بیان، بدیع، عروض وقافیہ کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

3۔ نہج الادب: اس میں فارسی زبان کے صَرف ونحو بیان کیے گئے ہیں۔

4۔ رسالۂ نجم الغنی: یہ رسالہ نہج الادب کا انتخاب ہے۔

5۔ منتہی القواعد معروف بہ قواعد حامدی: یہ بھی نہج الادب کا انتخاب ہے۔

6۔ تہذیب العقائد: یہ رسالہ علمِ کلام میں ہے اور عقائدِ نسفی کی شرح ہے۔

7۔ تعلیم الایمان: فقہِ اکبر کی ضخیم شرح ہے۔

8۔ مذاہب الاسلام: اس میں تمام اسلامی مسلکوں کی تفصیل ہے۔ یہ کتاب ایک بار تاریخ مذاہبِ اسلام کے نام سے بھی چھپی ہے۔

9۔ تذکرۃ السلوک: اس کتاب میں علمِ تصوف کا بیان ہے۔ اس میں مصطلحاتِ صوفیہ کو حروف تہجی کی ترتیب پر جمع کیا ہے۔

10۔ میزان الافکار: یہ فنِ منطق میں ہے۔

11۔ شرحِ نکتہ رسائلِ عبدالواسع: حروف تہجی اور اعداد مفردہ ومرکبہ میں تطبیق کا بیان ہے۔

12۔ سلک الجواہر فی احوالِ البواہر: یہ داؤدیہ بوہروں کی تاریخ ہے۔

13۔ شرح چہل کاف: اس رسالہ میں آیاتِ قرآنی سے فال نکالنے کی ترکیب

14۔ القول الفیصل فی شرحِ الطہر المتخلل: شرحِ وقایہ کے طہرِ متخلل کے بیان کو حل کیا ہے۔

15۔ مختصر الاصول: یہ اصولِ فقہ کا انتخاب ہے۔

16۔ مزیل الغواشی: یہ اصول الشاشی کی شرح ہے۔

مذکورہ سطور میں حکیم نجم الغنی کی جن تصانیف کا تذکرہ ہے وہ غیر طبّی موضوعات کی ہیں۔ یہاں ان کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ قاری حکیم صاحب کے علمی مرتبہ اور متنوع علمی شخصیت سے واقف ہو سکے۔

حکیم نجم الغنی نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے، اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ اخبار الصنادید سے ان کی مورخانہ شان کا اظہار ہوتا ہے اور تاریخ میں ان کی گہری بصیرت کا پتہ چلتا

ہے۔ اسلامیات اور دوسرے موضوعات کی تصانیف کا بھی یہی معاملہ ہے۔ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس کی گہرائی اور تہ تک پہنچ کر مواد تلاشتے ہیں۔ اسی طرح طب پر ان کی کتابوں کو دیکھ کر ایک ماہر طبیب کا پیکر سامنے آتا ہے۔ طب سے متعلق اُنہوں نے دو اہم تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ طبی موضوعات میں علم الادویہ کے میدان میں انہیں اختصاص حاصل تھا۔ ادویۂ مفردہ و مرکبہ پر اُنہوں نے دو نہایت بیش قدر کتابیں تالیف کی ہیں اور یہ دونوں کتابیں اپنے عنوانات پر ماخذ اور مرجع کا درجہ رکھتی ہیں۔

1۔ خزائن الادویہ

اس کا شمار ادویۂ مفردہ کی جامع ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ نجم الغنی نے یہ کتاب اردو زبان میں تالیف کی ہے، حالانکہ ان کے استاذ اور ماموں حکیم محمد اعظم خاں کی ساری کتابیں فارسی میں ہیں۔ مگر نجم الغنی نے عصری لسانی تقاضوں کو محسوس کر کے اردو زبان کو اپنی طبی تالیفات کے لیے وسیلہ بنایا۔ چار ضخیم جلدوں میں یہ کتاب نہ صرف ضخامت کے اعتبار سے، بلکہ منفرد تالیفی انداز اور تحقیقی اسلوب کے باعث طب کے ادویاتی ذخیرہ میں قدر و اہمیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اب تک اس پایہ کی کتاب ادویۂ مفردہ پر تالیف نہیں کی گئی۔ چونکہ اس کی زبان اردو ہے اور آج بھی زبان طب کی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کے مقصد سے رائج ہے۔ مزید براں ہمارے عہد کے طبیبوں کا مبلغ علم اسی زبان تک محدود ہے، لہٰذا یہ اِس وقت ادویۂ مفردہ کی سب سے زیادہ رجوع کی جانے والی کتاب ہے۔

بالعموم یہ کتاب چار جلدوں میں دستیاب ہے۔ مگر خزائن الادویہ کا میرے پیش نظر نسخہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ 1926ء میں برقی پریس لاہور سے طبع ہوا ہے۔ حکیم نیر واسطی نے بھی اس کی اشاعت کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی ساڑھے تین سو صفحات میں ادویہ کی تاریخ اور دیگر تمہیدی باتوں کے علاوہ کلیاتِ ادویہ سے متعلق مختلف موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔

اس کتاب میں مؤلف نے یونانی، آیورویدک اور کسی قدر ایلوپیتھک کے ادویاتی ماخذ سے استفادہ کر کے ان طبوں کی دواؤں کی تفصیل کو نہایت تحقیق کے ساتھ جمع کیا ہے۔ حکیم نجم الغنی

نے مندرجہ کتب کے علاوہ خزائن الادویہ کی تالیف میں محیط اعظم سے بطورِ خاص استفادہ کیا ہے۔اس کے مؤلف حکیم اعظم خاں، حکیم نجم الغنی رام پوری کے سگے ماموں ہیں اور انہیں کے زیر تربیت حکیم نجم الغنی نے طب کی تحصیل کی ہے۔ لیکن محیط اعظم سے استفادہ کے سلسلہ میں حکیم نجم الغنی کا رویہ نہایت ناقدانہ رہا اور انہوں نے اعظم خاں کی بہت سی فروگزاشتوں اور تالیف و ترتیب کی خامیوں کو اُجاگر کیا ہے۔اس سے نجم الغنی کی محققانہ روش اور غیر جانب دارانہ طرزِ تالیف کا پتہ چلتا ہے۔ اُنہوں نے قرابت داری اور استاذی رشتہ سے الگ ہو کر خالص فنی زاویۂ نگاہ سے محیط اعظم کا مطالعہ اور اس سے اخذ و استفادہ کیا ہے۔

2۔ قرابادینِ نجم الغنی

یہ حکیم نجم الغنی کی دوسری اہم تالیف ہے۔اس میں انہوں نے متقدمین کے علاوہ بہت سے اپنے وضع کردہ نسخے بھی شامل کیے ہیں۔ مؤلف نے واضعین کے ناموں کی نشاندہی بھی کی ہے۔قدماء کے نسخے ان کے ناموں کے حوالوں کے ساتھ درج کیے ہیں۔ نسخوں کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی ہے۔اس قرابادین کی تالیف میں آیورویدک قرابادینوں سے استفادہ کر کے مؤلف نے بہت سے ویدک مرکبات کی تفصیل بھی تحریر کی ہے۔

انیسویں صدی کی طبی تاریخ میں حکیم نجم الغنی رام پوری کا نام نہایت اہم ہے۔انہوں نے بیش قدر تالیفات کے ذریعہ یونانی طب کے علمی سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ بلا شبہ وہ اپنے دور کے حاذق اور عالم طبیب تھے۔ان کی ذہنی اور فکری تربیت میں حکیم محمد اعظم خاں کا بہت اہم کردار ہے۔ وہ رضا لائبریری، رامپور سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ چنانچہ ملازمت کے دوران انہیں لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطات و مطبوعات سے بھی کافی استفادے کا موقع ملا، اِس کا اظہار اُن کی کتابوں میں درج حوالوں سے ہوتا ہے۔

حکیم نجم الغنی نے 25 صفر 1351ھ مطابق بروز جمعرات 30 جون 1932ء کو وفات پائی۔انہوں نے طویل عمر پائی اور تا عمر علم و فن کی آبیاری میں مصروف رہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ نزہۃ الخواطر جلد 8، عبدالحئی حسنی، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدر آباد، اشاعت ثانی، 1981ء

2- اخبار الصنادید (حصۂ اول)، حکیم محمد نجم الغنی خاں رامپوری، رضا لائبریری رامپور، 1997ء

3- خزائن الادویہ (جلد اوّل)، حکیم محمد نجم الغنی خاں رامپوری، برقی پریس، لاہور، 1926ء

4- قرابادین نجم الغنی، حکیم نجم الغنی، مطبع منشی نول کشور، اشاعتِ ثانی 1928ء

5- تاریخ روابط پزشکی ایران وپاکستان، حکیم نیر واسطی، موسسہ مطالعات تاریخ پزشکی طب اسلامی و مکمل، ایران، بہمن ماہ 1382 ہجری شمسی

حکیم محمد حسن حاذقؔ میرٹھی

میرٹھ (عشق آباد) کا شمار ہندوستان کے اہم تاریخی مراکز میں ہوتا ہے۔ بعض شواہد کے مطابق یہ شہر راون کی جنم بھومی ہے۔ جدید ہندوستان میں اس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ 1857ء کی تحریکِ آزادی کا آغاز یہیں سے ہوا تھا۔ دلّی سے قریب ہونے کی وجہ سے اسے دلّی کا 'چھوٹا بچہ' کہا جاتا ہے۔ دلّی سے جغرافیائی قرب کے باعث یہ شہر وہاں کی علمی، فنی، تہذیبی اور لسانی قدروں سے بے حد متاثر رہا ہے۔

مغلیہ عہد کے اواخر سے یہاں طب کی شاندار اور اعلیٰ روایت کا پتہ چلتا ہے۔ پدم شری حکیم سیف الدین (سابق اعزازی طبیب صدر جمہوریہ ہند) کو بھی اسی خاک سے نسبت ہے۔ اِن کے بزرگوں میں حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی، غالب کے تلامذہ میں تھے، وہ شعر وادب کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھنے کے علاوہ ایک مستند طبیب بھی تھے۔ شاعرات کے تذکرہ پر ان کی کتاب 'بہارستانِ ناز' اپنے موضوع کی پہلی تالیف ہے۔ اس کا شمار تذکرۂ شاعرات کے اہم ترین ماخذ میں ہوتا ہے۔

میرٹھ میں طب وادب کی روایت کو فروغ دینے والوں میں ایک اہم نام حکیم محمد حسن حاذقؔ کا ہے۔ وہ بلند پایہ طبیب ہونے کے ساتھ شعر وادب کے میدان میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ مطب اور علمی وتدریسی مشاغل کے علاوہ انہوں نے طبی موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں تالیف کی ہیں۔

حکیم محمد حسن حاذقؔ نے عربی درسیات کی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی اور طبی علوم کی تحصیل، میرٹھ کے مشہور طبیب حکیم بلدیو سنگھ سے کی۔ حکیم محمد حسن حاذقؔ ایک قدیم طبی سلسلہ کے فرد ہیں۔ ان کے والد حکیم خادم حسین اور دادا حکیم کریم بخش کا شمار میرٹھ کے اچھے طبیبوں میں تھا۔

برطانوی عہد میں حکیم کریم بخش، حکومت کی طرف سے جیل کے قیدیوں کے علاج ومعالجہ پر مامور تھے۔ اسی لیے وہ حکیم کے ساتھ ڈاکٹر بھی کہلاتے تھے۔ حکیم کریم بخش کے والد حکیم امان اللہ، دادا حکیم غلام محمد اور پر دادا حکیم تاج محمد بھی اپنے وقت کے مشہور طبیب تھے۔ طبابت کے اس پشتینی سلسلہ کو حکیم محمد حسن حاذقؔ نے رفعت وکمال عطا کیا

حکیم محمد حسن حاذقؔ ادیب وطبیب دونوں تھے، لہٰذا ان کی تصنیفات میں ادب وانشاء کا رنگ نمایاں ہے۔ انہوں نے حلقۂ عوام میں طب کی تشہیر کے لیے تصنیف وتالیف کے ایک منفرد اسلوب کی شروعات کی۔ اس زمانہ میں داستان اور کہانیوں کا بڑا رواج تھا۔ حکیم محمد حسن حاذقؔ نے اسی عوامی اسلوب میں طبی کتابوں کی تالیف کا بیڑا اٹھایا، ان کے اس اسلوب سے طب کی عوامی تشہیر کے علاوہ طب اور ادب کے رشتوں کا احیاء ہوا۔

ان کی طبی تصنیفات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1۔ علاج النساء معروف بہ گل عباسی:

یہ ایک منفرد تصنیف ہے، جو بطرز ناول لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں حکیم محمد حسن حاذقؔ نے حکیم علی عباس عرف مسیح الزماں کی صاحبزادی، عصمت پناہی عباسی بیگم کے حالاتِ زندگی اِس طرح پیش کیے ہیں کہ اِس کے ذیل میں جملہ زنانہ طبی مسائل کا احاطہ ہوگیا ہے۔ امراض کے ساتھ ان کے اسباب وعلامات اور ان سے متعلق نسخہ جات کی تفصیل بھی آگئی ہے۔ اس طرح نہایت دلچسپ انداز میں انہوں نے خواتین کونسوانی صحتی معلومات سے واقفیت بہم پہنچانے کا کام کیا ہے۔

مختلف صحتی مسائل کے تئیں عوام میں بیداری اور شعور پیدا کرنے کے لیے موجودہ عہد میں نکڑ ناٹکوں اور ڈاکیومنٹری فلموں کا سہارا لیا جارہا ہے۔ مغربی ممالک میں مختلف سائنسی اور طبی موضوعات پر کثرت سے فلمیں بن رہی ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تفریح کے ساتھ طبقۂ عوام میں سائنس اور صحتی اُمور کی بابت بیداری پیدا کی جائے۔ جدید دنیا میں جو کام گزشتہ چند دہائیوں سے ہورہا ہے، حکیم محمد حسن حاذقؔ نے اسے ایک صدی پہلے انجام دیا ہے۔ اس سے ان کی دور بینی اور حذاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ کتاب تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔اس کی تیسری اشاعت 1939ء میں محبوب المطابع برقی پریس، دہلی سے ہوئی تھی۔اس کی ایک اشاعت ابو العلائی اسٹیم پریس، آگرہ سے بھی ہوئی ہے۔

2۔ توضیح الادویہ

یہ اردو زبان میں ادویۂ مفردہ پر ایک اچھی تالیفی کاوش ہے۔حکیم محمد حسن حاذقؔ نے جدول کے طرز پر دواء کا نام، مزاج، مضر، مصلح، بدل، مقدار، ماہیئت کی تفصیلات نہایت اختصار سے تحریر کی ہیں۔ یہ کتاب تقریباً ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے سرورق پر اُن کی دوسری تصانیف مثلاً خلاصۂ مخزن الادویہ، تفارق الامراض وتفارق الادویہ، مفتاح الادویہ، نصاب الطب، اُم الصبیان، شربتِ وصال، تریاقِ آتشک، معجونِ حیات، قرابادینِ حاذق، کیمیائے عشرت معروف بہ تریاق باہ کے علاوہ کئی غیر طبّی کتابوں کے نام تحریر ہیں۔ یہ کتاب منشی محمد ابراہیم کے زیرِ اہتمام مطبع افتخار، دہلی سے 1899ء میں شائع ہوئی ہے۔

3۔ رسالۂ معجونِ حیات:

فاضل مؤلف نے اس کتاب میں درازیٔ عمر کی تدابیر، حفظانِ صحت کے اصول وضوابط اور طریقِ معاشرت کی تفصیلات اردو زبان میں تحریر کی ہیں۔اُنہوں نے یہ کتاب، نواب میر محبوب علی خاں بہادر والیٔ حیدرآباد کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے تالیف کی تھی۔ یہ پہلی بار مطبع گلزار محمدی، میرٹھ سے شائع ہوئی تھی۔

یہ رسالہ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے آخر میں شیخ منشی نیاز علی متخلص بہ گوہرؔ میرٹھی کی قطعۂ تاریخ پر مشتمل ایک مدحیہ نظم شامل ہے،اس میں حکیم محمد حسن حاذقؔ کے سوانحی حالات اور فنی کمالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم محمد حسن حاذقؔ نے عربی درسیات لکھنؤ میں پڑھی تھیں اور طب کی تعلیم حکیم بلدیو سنگھ سے پائی تھی۔

4۔ نصابُ الطب:

اس کتاب میں حکیم محمد حسن حاذقؔ نے امراض اور ادویہ سے متعلق طبّی اصطلاحات،

بصورتِ نظم تحریر کی ہیں، تاکہ طلبہ انہیں آسانی سے یاد کر سکیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں!

جاں دار شیشعاں کو کائیفل   جوز بویہ کو کہیں سب جائیفل
بچھ کو تم اے جان جہاں وج کہو   جو سلیجہ ہے اسی کو تم تج کہو

5۔ ترجمہ قرابادین اعظم:
یہ حکیم محمد اعظم خاں کی تالیف قرابادین اعظم کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ ہے۔ یہ 1894ء میں شائع ہوا تھا۔ حکیم سید ظل الرحمان اپنے دادا حکیم سید کرم حسین کو اس کا شریک مترجم لکھتے ہیں، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔

6۔ ترجمہ اقسر ائی: یہ قانونچہ کی مشہور شرح کا اردو ترجمہ ہے۔

7۔ تفارق الامراض وتفارق الادویہ:
اس کتاب میں مؤلف نے متشابہ امراض اور ادویہ کے باہمی فرق کو واضح کیا ہے۔

8۔ تحفۂ جہاں حصۂ اول بزم عشرت: یہ جنسیات کے موضوع پر ایک اہم تالیف ہے۔

9۔ گلدستۂ فرحت معروف بہ افسانۂ حکمت:
یہ کتاب قصہ اور کہانی کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ حکیم محمد حسن حاذق نے آسان اور عام فہم اردو زبان میں اولاد سے محرومی، اس کے اسباب وعلامات اور علاج کو ناول کی صورت میں تحریر کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے حکیم محمد حسن حاذق کی اردو نثر نگاری اور شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

10۔ قرابادینِ حاذق:
یہ فارسی زبان میں متقدمین اور متاخرین کے مجربات کا مجموعہ ہے۔ اس میں حروف تہجی کی ترتیب پر مرکبات کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ 174 پر صفحات پر مشتمل یہ قرابادین، مطبع گلزارِ محمدی، میرٹھ سے 1893ء میں طبع ہوئی ہے۔

11۔ القرابادین:
حکیم محمد حسن حاذق نے اپنے پیر ومرشد سید شاکر علی کے ایما پر اسے تالیف کیا تھا۔ یہ قرابادین اردو زبان میں ہے اور 71 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نامی پریس، میرٹھ سے

شائع ہوئی تھی۔

حکیم محمد حسن حاذق نے 1928ء میں میرٹھ میں وفات پائی۔

مطالعاتی ماخذ

1۔ حیاتِ کرم حسین، حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعت دوم 2008ء

2۔ گلدستۂ فرحت معروف بہ افسانۂ حکمت، حکیم محمد حسن حاذق، ابوالعلائی پریس، آگرہ، 1928ء

3۔ معجون حیات، حکیم محمد حسن حاذق، مطبع مصطفائی، میرٹھ، غیر مورخ

4۔ توضیح الادویہ، حکیم محمد حسن حاذق، مطبع افتخار د، ہلی، 1899ء

5۔ علاج النساء معروف بہ گل عباسی، حکیم محمد حسن حاذق، طبع سوم محبوب المطابع برقی پریس، دہلی، 1939ء

6۔ مضمون 'حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی'، فاروق ارگلی، روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو، 10 فروری 2012ء

حکیم اجمل خاں

برطانوی حکومت کا زمانہ ہندوستانی تاریخ میں نہ صرف سیاسی لحاظ سے، بلکہ لسانی وتہذیبی اُمور اور مشرقی علوم کے حوالہ سے بھی نہایت پر آشوب خیال کیا جاتا ہے۔اس دورِ ابتلاء میں یونانی طب کو بھی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔اِن نامساعد حالات میں حکیم اجمل خاں اس قومی وملی ورثہ کے تحفظ کے لیے مسیحا بن کر سامنے آئے۔

حکیم اجمل خاں بروز منگل 11 فروری 1868ء کو پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم قدیم روایتی انداز میں ہوئی۔طب کی تعلیم اپنے والد حکیم محمود خاں اور بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں سے حاصل کی اور اس فن میں کمال پیدا کیا۔وہ نہ صرف ماہر اور شہرت یافتہ معالج تھے، بلکہ طب کی ترویج، طبی تعلیم وتحقیق اور دیسی طبوں کے حقوق کی بازیابی کے سلسلہ میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔طب کے میدان میں بیش قدر خدمات کے صلہ میں انہیں برطانوی حکومت کی طرف سے 'حاذق الملک' کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔

حکیم اجمل خاں ایک ماہر معالج اور حاذق طبیب تھے۔ان کے حیرت انگیز اور کامیاب معالجے کے سیکڑوں قصے زباں زدخاص وعام ہیں۔ان کی طبی مہارت کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ وہ لندن کے سفر میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ہمراہ چیرنگ کراس ہاسپٹل گئے، وہاں ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے ہاسپٹل کے سینئر سرجن اور بادشاہ کے اعزازی معالج ڈاکٹر اسٹینلے بائیڈ سے حکیم صاحب کا تعارف کروایا۔ڈاکٹر بائیڈ نے اُن کو اپنے وارڈ میں مدعو کیا۔ایک مریض کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر بائیڈ نے ورم مرارہ تشخیص کیا۔بائیڈ کے کہنے پر حکیم صاحب نے بھی مریض کا معائنہ کیا، مگر بائیڈ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ یہ ورمِ مرارہ کے بجائے امعاء کا مزمن قرحہ ہے۔ڈاکٹر بائیڈ نے

حکیم صاحب کی تشخیص کو مضحکہ خیز سمجھا اور اُن سے مخاطب ہو کر کہا کہ کل اس مریض کا آپریشن ہے، آپ بھی تشریف لائیں! آپریشن سے صحیح بات کا پتہ چل جائے گا اور یونانی اور ایلو پیتھی کا مقابلہ بھی ہو جائے گا۔ ڈاکٹر انصاری گھبرا رہے تھے کہ حکیم صاحب کی تشخیص غلط نہ ہو جائے، مگر آپریشن کے بعد حکیم صاحب کی تشخیص درست نکلی اور ڈاکٹر بائیڈ نے حکیم صاحب کی فنی بصیرت کا اعتراف کیا۔ حکیم اجمل خاں کے اس طرح کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ اس سلسلہ میں حکیم نذر احمد کی کتاب 'افاداتِ مسیح الملک' خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس کے مطالعہ سے حکیم صاحب کی فنی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

حکیم اجمل خاں کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مختلف طبی موضوعات پر متعدد رسائل تصنیف کیے۔ یہ اگر چہ حجم کے اعتبار سے مختصر ہیں، لیکن موضوع اور مباحث کے لحاظ سے نہایت وقیع ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1۔ القول المرغوب فی الماء المشروب:

بارہ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ مسیح الملک کے زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہے۔ اس میں انہوں نے ان اطباء کا ابطال کیا ہے، جو پانی سے غذائیت ملنے کے قائل ہیں۔ دراصل یہ رسالہ 'القانون' کی اس بحث کی شرح ہے، جس میں شیخ نے کہا ہے کہ پانی بدن کا تغذیہ کرنے کے بجائے غذا کی سرایت پذیری اور اس کے قوام کی اصلاح میں معاون ہوتا ہے یہ رسالہ 1902ء میں مطبع احمدی، رام پور سے اور 1904ء میں افضل المطابع، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ حکیم عبد اللطیف فلسفی نے اس رسالہ کے رد میں 'التحقیق المطلوب فی الماء المشروب' تحریر کیا تھا، جو 1923ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

2۔ الساعاتیہ:

یہ رسالہ چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ 'القول المرغوب فی الماء المشروب' کے ساتھ 1902ء میں مطبع احمدی، رام پور سے شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ مسیح الملک کی برجستہ تحریر کا ایک نمونہ ہے۔ اُنہوں نے اس رسالہ میں خون اور اعضاء کی حلاوت اور میٹھی چیزوں کی طرف طبیعت کے زیادہ راغب ہونے کے نظریہ کی تردید کی ہے۔

3۔ التحفة الحامدیة فی الصناعة التکلیسیة:

طب میں حکیم اجمل خاں کے ترقی پسندانہ رجحانات کے مطالعہ کے سلسلہ میں یہ رسالہ بے حد اہم ہے۔ اس میں کشتہ کے تعلق سے رجعت پسندانہ اور منفی خیالات کی تردید کرتے ہوئے کشتہ کے استعمال کے جواز پر دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ حکیم اجمل خاں یونانی معالجہ میں کشتوں کے استعمال کو فروغ دینے کے خواہاں تھے۔ اس لیے کہ یونانی دواسازی کی اصلاح وتجدید اور اسے معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کا ان کے پیش نظر جو منصوبہ تھا، اس کی تکمیل میں کشتے اور اس جیسے اوصاف کی حامل دوائیں نہایت معاون تھیں۔

حکیم اجمل خاں نے اس رسالہ میں کشتہ سازی کی تاریخی کڑیاں، مصر، یونان اور اٹلی سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس سلسلہ میں ان کے دلائل بہت مستحکم نہیں ہیں۔ حالانکہ اجمل خاں اس واقعہ کے معترف ہیں کہ یونانی معالجہ میں کشتوں کے استعمال کا رواج ہندی عہد میں ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یونانی اور عربی عہد میں دواسازی کی جو شکلیں رائج تھیں، ان میں تکلیس کا وجود ڈھونڈ پانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ ان ادوار میں یونانی دواسازی کے اندر زیادہ سے زیادہ احراق اور تحمیص جیسے صیدلاتی اعمال کا ثبوت مل پاتا ہے۔

رسالہ کے نام سے واضح ہے کہ یہ محمد حامد علی خاں کے نام معنون ہے۔ اس رسالہ کی اشاعت مطبع افضل المطابع، دہلی سے ہوئی ہے۔ 32 صفحات پر مشتمل یہ رسالہ ایک مقدمہ، دو ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

4۔ البیان الحسن بشرح المعجون المسمیٰ باکسیر البدن:

سولہ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ (1329ھ مطابق 1911ء) میں افضل المطابع، دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں معجون اکسیر بدن (معجون لنا) کے سلسلہ میں حکیم شریف خاں کے بیان کی شرح کی گئی ہے۔ ان امور کی وضاحت سرِ ورق پر درج کتاب کے نام اور اس کے نیچے تحریر عبارت سے بھی ہوتی ہے۔ رسالہ کی زبان عربی ہے لیکن دوا کی تیاری کا تذکرہ فارسی میں ہے۔

5۔ اوراق مزہرۃ مشمرۃ مسفرۃ:

یہ رسالہ چوبیس صفحات پر مشتمل ہے، 1902ء میں مطبع احمدی، رام پور سے اس کی اشاعت ہوئی تھی۔ اس میں جدری کی حالت اور حمل کے دوران مدرات کے استعمال ، ورمِ طحال میں مسہلات، سعال میں حموضات کے استعمال سے متعلق استفسار کا جواب دیا گیا ہے۔ کتاب کے سرِ ورق پر حکیم اجمل خاں کے نام کے نیچے مرتب ومؤلف کی حیثیت سے مولوی محمد ابراہیم رمضان پوری کا نام درج ہے۔

6۔ خمس مسائل:

یونانی طب کے پانچ مسائل پر مشتمل یہ ایک مختصر مضمون ہے، جو رموز الاطباء جلد اول میں شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون پانچ صفحات پر محیط ہے۔ اصل مضمون عربی زبان میں ہے ۔ حکیم فیروز الدین نے مضمون کے خاتمہ پر اس کا اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے۔ اس مضمون میں حکیم اجمل خاں نے بحران کے لیے دورۂ قمری کے لحاظ سے ایام کی تخصیص کو بے معنیٰ قرار دیا ہے۔ حمّی صفراوی کے وجود کا انکار کرتے ہوئے، صفراء کے تعفن اور اس کے ذائقہ کی تلخی کے متعلق جمہور اطباء کے نظریہ کی تردید کی ہے اور غذاءِ مطلق کے وجود سے انکار کیا ہے۔ مقالہ کی ابتداہی میں اجمل خاں نے اپنے اختلافی نقطۂ نظر کی و ضاحت کردی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"انّی اخالف جمہور الاطباء فی عدۃ مسائل لو جئتُ کلّہا
لما وسعہ الکراریس و لذٰلک احبُ ان اذکر ھھُنا خمس
مسائل فقط"

اس مضمون کا شمار حکیم اجمل خاں کی اہم تحریروں میں ہوتا ہے۔ اس سے حکیم اجمل خاں کے مجتہدانہ نقطۂ نظر، تنقیدی شعور اور اصابت فکر کا پتہ چلتا ہے۔ نیز قدیم طبّی سرمایہ کے سلسلہ میں

7۔ الوجیزۃ:

یہ رسالہ تیس صفحات پر مشتمل ہے۔ سید محمد عبد السلام کے زیر اہتمام 22 جمادی الاول

1335ھ (مطابق 16 مارچ 1917ء) کو مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ کلیاتِ قانون کی بحث نبض مستوی اور نبض مختلف کی شرح پر مشتمل ہے۔

8- مقدمۃ اللغات الطبیۃ:

حکیم اجمل خاں کے رسائل میں یہ مقدمہ بے حد اہم ہے۔ ان کے دوسرے کئی رسالوں کی طرح یہ رسالہ والیٔ رام پور نواب محمد حامد علی خاں بہادر کے نام معنون ہے ۔72 صفحات پر مشتمل یہ رسالہ مولوی محمد عبدالاحد کے زیر اہتمام مطبع مجتبائی، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ سرورق پر اشاعت کا سنہ 1334ھ مطابق 1916ء درج ہے، جب کہ اندرونی صفحہ پر 1915ء مرقوم ہے۔

حکیم اجمل خاں نے دستیاب طبی لغتوں کو ناقص اور ناکافی تصور کرتے ہوئے ایک ایسا لغت تالیف کرنے کا منصوبہ وضع کیا تھا، جو جامع اور مانع ہونے کے ساتھ اغلاط وشوائب سے پاک ہو۔ مسیح الملک کے ذہن میں لغت کا جو خاکہ تھا اور جن خطوط پر وہ اس کو ترتیب دینا چاہتے تھے، ان اساسی اصول وضوابط کو 'مقدمۃ اللغات الطبیۃ' کی صورت میں جمع کر دیا ہے۔ یہ رسالہ 34 ابواب پر مشتمل ہے۔

حکیم اجمل خاں نے طب کے علاوہ اسلامی تعلیم اور مسلمانوں سے متعلق دیگر امور میں بھی ہمیشہ تعاون پیش کیا۔ سرسید کی تعلیمی تحریک سے اجمل خاں کو شروع سے ہی دلچسپی رہی، وہ 1900ء میں علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی مقرر ہوئے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی حکیم صاحب کا تعاون حاصل رہا۔

1920ء میں ترکِ موالات کے زمانہ میں حکیم اجمل خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بالمقابل ایک نئی درس گاہ کے قیام کی آواز اٹھائی۔ 29 اکتوبر 1920ء کو علی گڑھ میں بدر باغ کے قریب جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی۔ جامعہ کے قیام سے لے کر اس کے فروغ تک کے مراحل میں حکیم اجمل خاں کا کردار نہایت کلیدی رہا۔ اس کے علاوہ اسلامیہ کالج دہلی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، مدرسہ الٰہیات کانپور، نظارۃ المعارف القرآنیہ، دارالعلوم معینیہ اجمیر کو بھی حکیم صاحب کا تعاون حاصل رہا ہے۔ خصوصاً ندوہ کے سلسلہ میں ان کی خدمات بے حد اہم ہیں۔

حکیم اجمل خاں کی زندگی کا ایک اہم پہلو میدان سیاست ہے۔ حکیم اجمل خاں کے

برطانوی حکومت سے خوشگوار تعلقات تھے، لیکن ملکی اور ملی خدمت کے جذبوں نے انہیں سیاست سے وابستہ کر دیا۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز 1906ء سے ہوا اور دھیرے دھیرے یہ وابستگی بڑھتی ہی گئی۔ اس زمانہ کی تمام سیاسی تحریکوں کو حکیم اجمل خاں نے عملی تعاون پیش کیا۔ مسلم لیگ، خلافت کانفرنس، جمعیۃ العلماء، انڈین نیشنل کانگرس، تحریکِ ترکِ موالات میں وہ نہایت سرگرم طور پر شریک رہے۔ ان کا شمار کانگرس کے عظیم رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ کانگرس صدر سی آر داس کی گرفتاری کے بعد وہ کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

سیاست کے میدان میں وہ ایک سیکولر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی سیکولر شبیہ کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ 1921ء میں ہندو مہاسبھا کا دہلی میں اجلاس منعقد ہوا تو حکیم صاحب استقبالیہ کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔

حکیم اجمل خاں کی فکر، عصبیت اور تنگ نظری سے پاک تھی۔ ان کی ہردلعزیزی کا ایک بڑا سبب ان کی مذہبی رواداری تھی۔ حکیم اجمل خاں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے جو کوششیں کیں ان کے اثرات نہ صرف سیاسی میدان میں، بلکہ ان کے دوسرے کاموں میں بھی محسوس ہوتے ہیں۔ طبی کانفرنس میں ویدوں کی شمولیت۔ طبیہ کالج میں آیورویدک تعلیم، ہندوستانی دواخانہ اور دوسرے شعبوں میں ہندوؤں کی شمولیت وغیرہ ان کی مذہبی رواداری کی بڑی واضح مثالیں ہیں۔

طب کے تحفظ اور فروغ کے تعلق سے حکیم اجمل خاں کا ایک بڑا کارنامہ آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس ہے۔ اس کا قیام 1906ء میں ہوا تھا۔ اس وقت اس کی حیثیت ایک مقامی تنظیم سے زیادہ نہیں تھی۔ 1910ء میں بمبئی میڈیکل ایسوسی ایشن نے صوبائی حکومت کے پاس ایک تجویز ارسال کی۔ ایسوسی ایشن کا مطالبہ تھا کہ قانونی معاملات میں حکیموں اور ویدوں کے جاری کردہ سرٹیفکٹ ناقابل اعتبار ہونے چاہئیں اور اس قسم کے سرٹیفکٹ جاری کرنے کا حق صرف ان ڈاکٹروں کو ہونا چاہیے، جنہوں نے ایلوپیتھی کی منظور شدہ درس گاہوں سے تعلیم حاصل کی ہے۔ حکومت نے اس تجویز پر ایک رجسٹریشن ایکٹ بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس ایکٹ کی منظوری کا مطلب تھا کہ مغربی طب کے علاوہ دوسری تمام طبیں غیر علمی اور غیر سائنٹفک ہیں اور یہ ایکٹ دیسی طبوں کی تباہی کا باعث بن جاتا۔ اس ایکٹ کے مضمرات کو محسوس کرتے ہوئے حکیم

اجمل خاں اس کے خلاف کمر بستہ ہوئے اور طبی کانفرنس کے ذریعہ دیسی طبوں کے حاملین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور ان کے تحفظ و بقاء کے لیے جد وجہد شروع کی۔ انہوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے طب کی اس تحریک کو قومی تحریک بنا دیا اور حکومت کو اس خطرناک ایکٹ کی منظوری سے باز رکھا۔ مانٹگو چیمسفورڈ اسکیم کے نفاذ اور مدراس کمیٹی کی رپورٹ کے بعد، جس میں یونانی اور آیورویدک کی فنی خدمات اور ان کی علمی حیثیت کا اعتراف کیا گیا تھا، دیسی طبوں کے فروغ کی راہیں ہموار ہوئیں۔ یہ سب طبی کانفرنس کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

حکیم اجمل خاں کے طبی کاموں میں مدرسہ طبیہ کا فروغ، ہندوستانی دواخانہ، مدرسہ طبیہ زنانہ وغیرہ بے حد اہم کارنامے ہیں۔ ان سب پر علاحدہ عنوان کے تحت گفتگو کی جائے گی۔ طب کے حوالے حکیم اجمل خاں کے جتنے کام ہیں، ان میں سب سے اہم طبی نصاب کی تیاری اور شعبۂ تحقیقات کا قیام ہے۔ حکیم صاحب کی نصابی اصلاحات اور ان کے قائم کردہ شعبۂ تحقیقات کے اثرات موجودہ طبی دنیا میں بھی محسوس ہوتے ہیں۔ ہمارے عہد میں تعلیم و تحقیق کے وہی مناہج اور خطوط رائج ہیں، جن کی بنا حکیم اجمل خاں نے ڈالی تھی۔ اس لیے نصابِ تعلیم اور تحقیقات سے متعلق ان کے افکار و نظریات کو مستقل موضوع بنا کر آئندہ صفحات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

مطالعاتی ماخذ

1۔ حیاتِ اجمل، قاضی عبد الغفار، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1950ء

2۔ تذکرہ مسیح الملک، محمد حسن قرشی، کریمی پریس، لاہور، 1928ء

3۔ رسائلِ مسیح الملک، ترجمہ محمد رضی الاسلام ندوی، 1991ء

4۔ حکیم اجمل خاں کی علمی خدمات، محمد رضی الاسلام ندوی، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، 2004ء

5۔ حکیم اجمل خاں، حکیم سید ظل الرحمان، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، 2004ء

6۔ حکیم اجمل خاں، ظفر احمد نظامی، پبلی کیشن ڈویژن، وزارتِ اطلاعات و نشریات، حکومتِ ہند، 1998ء

7۔ اجملِ اعظم، انتظار حسین، یادگار اجمل، لاہو، 1995ء

حکیم اجمل خاں اور یونانی نصابِ تعلیم

ہندوستان کے اقتصادی و معاشی شعبوں میں تبدیلیوں کا آغاز اسی وقت ہوگیا تھا، جب یورپ اور دوسرے مغربی ممالک سے اس کے تجارتی روابط استوار ہوئے اور غیر ملکی تاجروں کی ہندوستان آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ اثرات دوسرے شعبہ ہائے زندگی تک پھیل کر سماجی، معاشرتی اور تہذیبی معاملوں کو بھی متاثر کرنے لگے، اس طرح تجارتی امور کے ساتھ دوسرے معاملات میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی دخیل ہوگئی۔

اس غیر ملکی تسلط کے خلاف بڑھتی عوامی بے چینی 1857ء کا واقعہ بن کر سامنے آئی۔ اس تحریک کی ناکامی کے بعد یہاں کا تہذیبی، معاشرتی اور سماجی ڈھانچہ، مغرب کے مقابلہ میں دفاعی پوزیشن میں آگیا اور ہندوستانیت کے وجود اور اس کے تحفظ و بقا کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ چونکہ غیر ملکی تسلط کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر تھا، لہٰذا قدیم معالجاتی نظام بھی مغربی بالادستی کا شکار ہوا اور صدیوں سے رائج علاجی دستور کو ہٹا کر جدید طبی نظام کو رواج دینے کی کوشش کی جانے لگی۔

یونانی طب مشرقی علوم کا حصہ ہونے کے علاوہ مسلمانوں کی ایک اہم تہذیبی میراث بھی تھی، اس کا خاتمہ اور مغربی طب کا فروغ محض طریقہ کی تبدیلی سے عبارت نہیں، بلکہ یہ ایک ایسے تہذیبی ورثہ کا زیاں تھا، جس کی آبیاری میں صدیوں کی دماغی کاوشیں شامل رہی ہیں۔ اس فن کے تحفظ اور اس کے فروغ و استحکام کے لیے حکیم محمود خاں اور ان کے جانشین سب سے پہلے سامنے آئے۔

شریفی خاندان میں مطب و معالجہ کے ساتھ تعلیم و تدریس کا رواج پہلے سے تھا، مگر

تعلیم کا یہ روایتی طریقہ مغربی یلغار کے مقابلہ کے لیے ناکافی تھا، لہٰذا اس سلسلہ کو منظم اور مربوط کرنے کی ضرورت تھی۔ اب تک تعلیم کا دائرہ مروجہ کتابوں تک محدود تھا اور حصولِ طب کا قاعدہ یہ تھا کہ طلبہ، اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ کتابیں پڑھ لیتے اور طب کی مشق میں لگ جاتے۔ چونکہ یہ طریقۂ تعلیم یونانی طب کے محض چند مضامین پر مشتمل تھا اور اس سے خاندان کے افراد یا مخصوص تلامذہ ہی مستفیض ہو سکتے تھے، اس لیے اس روایتی نظام سے طب کے تحفظ کا سامان ممکن نہیں تھا۔ اسے محسوس کرتے ہوئے حکیم عبدالمجید خاں نے 'مدرسہ طبیہ' کی شکل میں طبی تعلیم کو منظم اور عام کرنے کی کوشش شروع کی۔

اس مدرسہ کے قیام سے پہلے طبی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ کتابوں کے نام سے جماعتیں قائم تھیں۔ مثلاً جماعتِ کلیاتِ قانون اور جماعتِ شرحِ اسباب وغیرہ۔ حکیم عبدالمجید خاں نے 'مدرسہ طبیہ' کے قیام کے بعد کلاس سسٹم قائم کر کے جماعتوں کے ضوابط طے کیے، ان کا سشن اور مدتِ تعلیم متعین کی۔

'مدرسہ طبیہ' کے قیام کے بعد بانیان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ نصاب کا تھا۔ دراصل مغربی طب کے سامنے یونانی طب کا قدیم اسلوب نامانوس بن گیا تھا۔ حالانکہ عوامی رجحان اب بھی یونانی طب کے ساتھ تھا، لیکن رواج اور روایت کی بنیاد پر علمی دنیا میں استناد حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے طبی مباحث کو ایسے اسالیبی قالب میں منتقل کرنے کی ضرورت تھی، جو معاصر دنیا کا طرز تھا۔ اب تک طب کی تعقل پسندی، منطقی اور فلسفیانہ طرز استدلال کے سہارے قائم تھی، لیکن بدلتے علمی رجحانات سے طبی نظامِ تعلیم کو ہم آہنگ کرنے کے لیے، اسے ایسے اسلوب میں پیش کیے جانے کی ضرورت تھی، جو موجودہ دنیا کے لیے قابلِ فہم ہو اور یہ کام نصابی اصلاح کے بغیر ناممکن تھا۔ قدیم نصاب کی تجدید کے وقت اس کے مصطلحاتی ڈھانچہ اور قدیم ہیئت میں بڑے پیمانے پر اصلاح کی ضرورت تھی۔ حکیم اجمل خاں نے اس مسئلہ کی طرف اطباء کو متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''ہمارے کورس میں شامل طبی کتابیں بے شمار منطقی استدلال، بہت سے فلسفیانہ مباحث اور علمی حقیقت کے ادق مسائل سے بھری پڑی ہیں، اب علمی دنیا کو ان کی بالکل ضرورت نہیں ہے اور ان کی وجہ سے ہماری طب بہت مشکل ہوتی

جارہی ہے۔ لہٰذا طبی مسائل کی بنیاد قدیم فلسفہ کے بجائے تجربات و مشاہدات پر رکھی جانی چاہیے۔ کیونکہ قدیم فلسفہ کی حالت یہ ہے کہ اس کے بیشتر مسائل حکماء کے درمیان مختلف فیہ ہیں اور آج تک ان کا کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو سکا ہے"

1883ء میں 'مدرسہ طبیہ' کی ابتدا ہوئی اور 23 جولائی 1889ء کو اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ روایت پسند طبی دنیا کے لیے یہ بے حد نیا واقعہ تھا۔ چنانچہ اس کے قیام کے ساتھ ہی طبیبوں کے اختلافات سامنے آنے لگے۔ حکیم اجمل خاں نے 'اکمل الاخبار' میں اس کے قیام کو وقت کی ضرورت بتاتے ہوئے اور اس کے نصابی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

"ڈاکٹری کی تعلیم کو مدرسہ میں لازمی قرار دیا گیا ہے۔ نعشوں کی تشریح اور مختلف اقسام کی جراحیوں کو دیکھنے کے لیے سول ہسپتال میں طلبہ کو بھیجنے کی اجازت حاصل کر لی گئی ہے اور طلبہ کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ لازمی طور پر ہسپتال میں حاضری دیں، علم طبیع اور جدید سائنس کے لکچروں کو سننے اور طبیعیات کے تجربے دیکھنے کا بھی ذریعہ پیدا کیا گیا ہے"۔

طبی نصاب کے بارے میں حکیم اجمل خاں نے یہ مسلک اپنایا کہ قدیم و جدید نظریوں کے درمیان ایسی روش کا انتخاب کیا جائے، جو خالص یونانی فلسفہ یا مغرب کے مادی اصولوں پر مبنی ہونے کے بجائے ایسے امتزاج کی حامل ہو، جس سے دونوں طبوں کی مفید معلومات سے استفادہ کا موقع فراہم ہو۔ 1921ء میں کالج کی سہ سالہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے حکیم اجمل خاں نے نصابِ تعلیم سے متعلق اپنے اس موقف کا اعادہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"میں مغربی طب کا مخالف نہیں ہوں اور نہ یہ درس گاہ کسی کی حریف ہے۔ ہم نے فنونِ طبیہ کے نظام کو اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ ہمارا تنہا یہی مقصد نہیں ہے کہ ہم اپنے قدماء کے صحیح اور بااصول طریقوں پر پوری طرح اپنے آپ کو قائم رکھیں، بلکہ یہ مقصد بھی ہے کہ طبی سائنس نے دنیا کے جس حصہ میں جو ترقی کی ہے، اس سے فائدہ حاصل کریں۔ ہر ایک سائنس کے لیے ہم اسے ایک بدنصیبی تصور کرتے ہیں کہ اس کے دروازے بند کر دیے

جائیں اور سائنٹفک تحقیقات کی روشنی کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ چونکہ دنیا کی ہر طب نامکمل ہے، ہم کشادہ دلی کے ساتھ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اپنے بزرگوں کے کبھی نہ فنا ہونے والے صحیح اصول اور طریق کو قائم رکھتے ہوئے، ہم ہر وہ کوشش جو اپنی طبوں کو اعلیٰ اور مکمل بنانے کے لیے کر سکتے ہیں، اختیار کرنے کو ہر وقت تیار رہیں گے"۔

طبی نصاب کے باب میں اپنے نظریہ کی حکمت اور اسے اپنائے جانے کے پیچھے کیا محرکات ہیں؟، اسے مسیح الملک نے 1925ء میں جلسۂ تقسیمِ اسناد کے موقع پر طبیہ کالج کے اساتذہ وطلبہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا:

"آپ سب حضرات کو معلوم ہے کہ ہماری طب پر ایک مدت سے جمود و تعطل کی کیفیت طاری ہے۔ برصغیر پر انگریزوں کے تسلط نے مرے کو مارے شاہ مدار کا مصداق کر دیا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے ملک کی طب کو یہاں رائج کرنے کے لیے ہماری طب کو اپنی راہ سے ہٹانا ضروری خیال کیا۔ میں نے اس صورتِ حال کو دیکھ کر طبیہ کالج کے نصابِ تعلیم میں طبِ اسلامی کے ساتھ ایلوپیتھی کے مضامین کو بھی شامل کیا ہے تا کہ یہاں پڑھنے والے طلبہ اپنی طب کے فلسفہ کے ساتھ ایلوپیتھی کا بھی جائزہ لے کر علیٰ وجہ البصیرہ اپنے فن کی خوبیوں کے قائل ہو سکیں۔ اور ان کے دلوں پر ایلوپیتھی کی جو دھونس طاری ہے، وہ رفع ہو سکے۔ نصاب میں جو جدید مضامین شامل کیے گئے ہیں، وہ دو طرح کے ہیں: ایک تو وہ ہیں، جو طبِ اسلامی اور طبِ مغربی میں مشترک ہیں۔ مثلاً تشریح، منافع الاعضاء، علم الجراحت اور علم القابلہ وغیرہ اور دوسرے وہ مضامین ہیں، جو خالص ایلوپیتھی کے ہیں، مثلاً علم الجراثیم اور علم العلاج وغیرہ۔ مقدم الذکر مضامین میں کسی ایک طب کا فلسفہ نہیں، بلکہ وہ اعضاء کی ساخت اور منافع وغیرہ کا بیان ہے۔ موخر الذکر مضامین میں ایلوپیتھی کا فلسفۂ علاج ہے، جس کے اصول ہمارے طریق سے مختلف ہیں۔ طلبہ کو بالخصوص ان مضامین کا مطالعہ کرنا چاہیے، جس سے انہیں پتہ چل سکے کہ ان

میں حقیقت کم اور نمائش زیادہ ہے اور اس نمائش کی چکا چوند نے اطباء کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا ہے اور جدید طب کے حاملین کے سامنے ان کی نگاہیں نہیں اٹھتیں۔ گویا وہ ان سے شرما رہے ہیں۔ اس احساسِ کمتری کو دور کرنے کے لیے طبیہ کالجوں کے نصاب میں جدید مضامین شامل کیے ہیں''۔

قدیم و جدید معلومات پر مشتمل نصاب کا جو خاکہ مسیح الملک کے ذہن میں تھا، اس کے بارے میں وہ چاہتے تھے کہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرولباغ کے ساتھ ہندوستان کے دوسرے طبی اداروں میں بھی رواج پائے۔ طبیہ کالج قرولباغ کے سلسلہ میں ان کی خواہش تھی کہ یہ کالج ہندوستان کی دوسری تعلیم گاہوں کے لیے نمونۂ عمل بنے اور ان کی فکری رہنمائی کا اس کالج سے سامان فراہم ہو۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ نصابی اصلاح کے اس مشن میں بانیانِ کالج اور یہاں کے اساتذہ اپنا کردار ادا کریں۔

نصابی اصلاح کو وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اپنے کالج کے ذمہ داروں اور اساتذہ کے ساتھ ہندوستان کے دوسرے طبیبوں کی توجہ وہ برابر اس امر کی طرف مبذول کراتے رہے، مثلاً 1925ء میں دہلی میں منعقد آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس سے خطاب میں اُنہوں نے کہا تھا:

''آپ سبھی کا فرض ہے کہ اپنے نصاب کی اصلاح کریں اور جدید تالیفات تیار کر کے اس ضرورت کی تکمیل کریں۔ جب آپ اس راستہ پر قدم رکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سدیدی، نفیسی اور حمیاتِ قانون آپ کی نصابی ضرورت کے لیے ناکافی ہیں۔ لہٰذا قدیم طبی ذخائر کی تلاش و تحقیق کو جدید معلومات کے ساتھ ملا کر ایک ایسا نصاب مرتب کرنا ہوگا، جو دونوں قسم کی معلومات کا جامع ہو''۔

حکیم اجمل خاں نے اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے کے لیے 1925ء میں دہلی میں منعقد کانفرنس کے اجلاس میں ایک سب کمیٹی کے قیام کی تجویز رکھی اور اس کے ذمہ یہ کام تفویض کیا کہ وہ نصابی مسائل پر غور و خوض کر کے چھ ماہ کے اندر رپورٹ پیش کرے اور یہ بتائے کہ جدید تحقیقات کو طبی نصاب میں کس طرح داخل کیا جاسکتا ہے؟۔

مسیح الملک کی تجویز کے مطابق کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیٹی نے نصاب کی اصلاح اور طبی درسیات سے جڑے تمام مسئلوں پر غور و خوض کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ نصاب کی اصلاح کے لیے موجودہ کتابوں کو تبدیل کر کے درسیات کی نئی کتابیں تیار کی جائیں۔ نئے نصاب کی تیاری کے وقت اس بات کا التزام کیا جائے کہ یونانی طب کا وہ سرمایہ جو ابھی غیر مطبوعہ ہے اور اساتذہ وطلبہ کے دسترس سے باہر ہے، اسے موجودہ نصاب میں شامل کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ کمیٹی کی دوسری تجویز یہ تھی کہ جدید طبی سرمایہ کی محقق اور ثابت شدہ چیزوں کو طب کی نئی درسیات میں شامل کیا جائے اور یہ اسی اسلوب اور طرز پر ہوں جو قدیم طبی کتابوں کا رہا ہے۔

حکیم اجمل خاں کے نصابی اصلاح کے منصوبہ میں تشریح اور جراحت کے شعبہ کو ترجیح کا درجہ حاصل تھا، ان دونوں شعبوں میں وہ طبِ جدید سے مکمل استفادہ کے حق میں تھے۔ انہوں نے کئی موقعوں پر طبیبوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی ہے۔ لکھنؤ میں منعقد کانفرنس کے اجلاس میں اطباء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''جراحی اور علم تشریح کی تعلیم میں حسب ضرورت مغربی طب سے مدد لی جائے
> اس تدبیر سے ہم اپنی جراحی کے عیب اور علم تشریح کے نقصان کو پورا کرسکیں گے''۔

اسی طرح 15 اپریل 1912ء کو انجمن طبیہ کے سالانہ جلسہ میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

> ''ہم طبیبوں نے شعبۂ جراحت کو بالکل نظر انداز کر رکھا ہے۔ علم کے میدان میں دنیا کافی آگے بڑھ چکی ہے، لہٰذا موجودہ حالات میں صرف مشرقی طب کی تعلیم ناکافی ہے۔ اگرچہ اصول علاج کے باب میں ہماری طب کو جامعیت کا دعویٰ ہے اور یہ دعویٰ حق بجانب ہے، لیکن تشریح اور جراحت کے باب میں ہمیں مغرب سے استفادہ کی ضرورت ہے''۔

مسیح الملک سے پہلے ان کے برادر بزرگ حکیم عبدالمجید خاں نے 'مدرسہ طبیہ' کے نصاب میں علم تشریح کی کمی محسوس کرتے ہوئے حکیم محمد صادق کی کتاب 'شرحِ تشریح اعضاءِ مرکبہ' کو داخل کر رکھا تھا۔

حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم اجمل خاں، دونوں اس بات کے موئید تھے کہ طبِ جدید نے اناٹومی اور سرجری کے میدان میں جو ترقی کی ہے وہ بیش قدر ہے اور ان علوم کے تعلق سے جدید طب میں بہت اہم سرمایہ ہے۔ اس کے برعکس یونانی طب کی کتابیں ان علوم کے باب میں تہی دامن ہیں، لہٰذا مغربی طب کے ان شعبوں سے پورے طور پر استفادہ کرنا چاہیے۔ غالباً ان کے اس خیال کا محرک یہ تھا کہ طبی نصاب میں ان اضافوں سے طب کے نظریات اور مبادیات کے متاثر اور آلودہ ہونے کا خدشہ نہیں تھا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ عزیزی اور شریفی خاندان میں ہمیشہ فنی چشمک رہی، خصوصاً جدید طب سے استفادہ کے باب میں خاندانِ عزیزی کا رویہ ہمیشہ سخت رہا۔ انہوں نے آمیزش اور اختلاط کی ہر تجویز کی شدومد کے ساتھ مخالفت کی، لیکن جراحت اور تشریح سے استفادہ کے باب میں ان کا رویہ مختلف تھا، اس سلسلے میں جدید طب سے استفادہ کی ضرورت انہوں نے بھی محسوس کی اور اس کے لیے عملی اقدامات کیے۔

تشریح اور جراحت کے باب میں اس عہد کے یونانی طبیبوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی احساس تھا کہ یونانی طب میں اس موضوع پر علمی سرمایہ نہایت محدود ہے اور عملی طور پر یہ شعبہ متروک ہو چکا ہے، لہٰذا یہ دونوں شعبے علمی اور عملی دونوں سطحوں پر اصلاح کے محتاج ہیں۔ طب کے ان شعبوں کے بارے میں غیر طبی حلقہ کے محسوسات کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ جب حکیم اجمل خاں نے مجوزہ طبیہ کالج کے سنگِ بنیاد کے سلسلہ میں لارڈ ہارڈنگ سے درخواست کی تو ان کی طرف سے یہ شرط رکھی گئی کہ اگر کالج کے نصاب میں اناٹومی اور سرجری کی تعلیم کی فوقیت کو تسلیم کیا جائے تو وہ افتتاح کی رسم کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں۔

حکیم اجمل خاں نے وائسرائے کی اس شرط کے جواب میں انہیں مطلع کیا کہ اس سلسلہ میں ان کا بھی یہی منصوبہ ہے۔ سنگ بنیاد کی تقریب میں حکیم اجمل خاں نے وائسرائے کی خدمت میں جو ایڈریس پیش کیا، اس میں کالج کے نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''گو کہ ہمارے ملک میں ویدک اور یونانی کی تعلیم پرائیویٹ طرز پر ہو رہی ہے اور کئی مدرسے ان علوم کی اشاعت میں کام کر رہے ہیں، لیکن ان کے معیارِ تعلیم

کو بلند کرنے اور مغربی طب کے بعض ضروری حصوں سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے ہم کو ضرورت تھی کہ ایک ایسا کالج بنائیں جو ہماری ضرورتوں کو کافی ہو سکے اور جس میں باقاعدہ دیسی طب کی تعلیم اناٹومی اور سرجری کے ساتھ دی جائے"۔

حکیم اجمل خاں کے ایڈرس کے جواب میں لارڈ ہارڈنگ نے جو تقریر کی تھی اس میں اُنھوں نے اناٹومی اور سرجری سے متعلق اپنی شرط کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

"اگرچہ مجھے خود آیورویدک اور یونانی طریقۂ علاج پر اعتقاد نہیں ہے، تاہم میں یہ تسلیم کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ ان میں بھی بہت سی عمدہ باتیں ہیں اور ان لوگوں کے لیے، بہت مناسب ہیں، جو عرصۂ دراز تک مغربی سائنس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، بشرطیکہ اسے موجودہ ضروریات کے مطابق بنالیا جائے۔ میں نے حاذق الملک کے پاس یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر ان کا مقصد آیورویدک اور یونانی کے معیار کو بلند کرنا ہے، ان کی برائی کو پاک کرنا اور نیم حکیموں اور ان کی چالوں سے لوگوں کو بچانا ہے تو مجھے اس کا سنگ بنیاد رکھنے میں خوشی ہوگی، میں نے ساتھ ہی یہ رائے دینے کی بھی جرأت کی تھی کہ سرجری اور علمِ تشریح مغربی اصولوں کے مطابق پڑھائے جائیں، کیونکہ میرے خیال میں یہاں کی طبوں میں ان کی کمی تھی۔ مجھے حاذق الملک نے ان تمام امور کے متعلق اطمینان دلا دیا ہے"۔

'مدرسہ طبیہ' کے ابتدائی ایام میں فارسی اور عربی میڈیم کے دو شعبے قائم تھے اور ان دونوں شعبوں میں انھی زبانوں کی کتابیں داخلِ نصاب تھیں۔

بلاشبہ اس زمانے میں عربی و فارسی کو علمی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ مگر حلقۂ عوام میں اردو روزمرہ کی زبان بن چکی تھی اور اس نے علمی بار اٹھانے کی صلاحیت بھی پیدا کرلی تھی، لہٰذا عربی و فارسی کے بجائے مسیح الملک نے اردو زبان میں طبّی تعلیم کی وکالت کی۔ حکیم اجمل خاں کا احساس تھا کہ غیر مانوس زبانوں میں تعلیم کی وجہ سے لسانی مسائل کے حل میں طلبہ کی صلاحیت کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے مدرسہ طبیہ کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک اہم قدم اٹھاتے ہوئے اردو

زبان میں تعلیم کو لازمی قرار دیا اور اس کا انتظام یہ کیا کہ میڈیکل کالج، آگرہ میں داخلِ نصاب اناٹومی کا مکمل اردو ترجمہ، تین حصوں میں تقسیم کر کے ہر جماعت کے کورس میں شامل کر دیا۔

حکیم اجمل خاں کی تحریک پر اطباء نے اردو زبان میں کتابیں تالیف کرنا شروع کیں۔ حکیم محمد الیاس خاں، حکیم محمد کبیر الدین، حکیم خواجہ رضوان احمد اور حکیم سید اشتیاق احمد وغیرہ نے طبّی درسیات کے لیے اردو زبان میں ایسی کتابیں تالیف کیں، جن میں حکیم اجمل خاں کی نصابی فکر کی پیروی کرتے ہوئے طبّی معلومات کے ساتھ مغربی طب کے مفید اضافات شامل کیے۔

طبّی تعلیم کو جن خطوط پر گامزن کرنے کے لیے مسیح الملک نے تحریک شروع کی تھی، اس کے اثرات بعد میں قائم ہونے والے نظام پر واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ سی سی آئی ایم کے قیام کے بعد جب اس ملک کے سارے تعلیمی اداروں میں ایک نصاب اور ایک مدتِ تعلیم کا نظام رائج ہوا، تو درسیات کے انتخاب میں اجملی فکر کی تقلید کی گئی۔ 1969ء میں دیسی طبوں کی کونسل کے قیام اور 1971ء میں طبیہ کالج، علی گڑھ میں پی جی تعلیم کے آغاز کے بعد تعلیم و تحقیق کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ ان دونوں جگہوں پر تعلیم و تحقیق کے جس اسلوب کا سلسلہ شروع ہوا، اس میں بھی اجملی فکر کے اثرات صاف محسوس ہوتے ہیں۔

حکیم اجمل خاں کے پیشِ نظر طبّی نصاب میں جدید مضامین کی شمولیت کا مقصد میڈیکل سائنس کے جدید رجحانوں سے واقفیت اور طب کو میڈیکل سائنس کے معاصر اسلوب سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ تاکہ جدید علمی دنیا کو طبِ قدیم کا انداز غیر مانوس نہ لگے اور اطباء تقلید کے خول سے نکل کر جدید تقاضوں کی روشنی میں اپنے فن کی اصلاح کرنے کے اہل ہو سکیں۔ معاصر طبوں سے موازنہ کر کے اپنی کمیوں اور خوبیوں کا جائزہ لے سکیں اور ان علمی حملوں کا جواب دینے کے لائق ہو سکیں، جو دوسرے حلقوں کی طرف سے یونانی طب پر وارد ہو رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے دوسرے دہے سے حکیم اجمل خاں کے قائم کردہ خطوط پر طبّی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ اس طرح طبّی درس گاہوں میں حکیم اجمل خاں کے نصاب پر تجربہ کی ایک صدی مکمل ہو چکی ہے۔ نئے الفیہ میں طبّی تعلیم کے خطوط متعین کرنے سے پہلے اجملی نصاب کے مثبت و منفی اثرات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

گزشتہ سو برس سے جاری طبی نصاب کی حصولیابیوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے اطباء کے درمیان بہت سی جدید اصطلاحوں کا رواج ہوا ہے اور انہیں قدیم مصطلحات پر منطبق کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نیز درسی کتابوں میں قدیم نظریات کے متوازی طب جدید کی معلومات درج کرنے کا اہتمام ہوا ہے۔ اس نصاب کی تعلیم سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ اس کے پڑھنے والے کسی حد تک جدید معلومات سے آشنا ہو گئے، مگر وہ مقصد حاصل نہیں ہوا، جو حکیم اجمل خاں کا اصل مطمح نظر تھا۔ اس لیے کہ پچھلے سو سال میں ہم نے جدید علمی دنیا کے سامنے طب کی جو تصویر پیش کی ہے، اس سے ان کے رجحان میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں نظر آتی، جس سے کسی قسم کے حسنِ ظن کا اظہار ہو رہا ہو اور اطباء کی موجودہ نسل کے اندر مرعوبیت کے بجائے اعتماد کا احساس پیدا ہوا ہو۔

اب تک کے تعلیمی تجربہ کے جو نتائج سامنے آئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ طب جدید کا سبق پڑھنے کے بعد طلبہ فنی ارتداد کا شکار ہو رہے ہیں اور ان کی نگاہوں میں قدیم طبی سرمایہ مشکوک ہو رہا ہے۔ ان اصلاحی کوششوں کے برآمد ہونے والے منفی نتائج سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ طب جدید سے استفادہ کا نظریہ غلط ہے۔

بلا شبہ طبی تعلیم کے باب میں حکیم اجمل خاں کے افکار اُن کے عہد کی طرح ہمارے زمانے کی بھی ضرورت ہیں اور ان کا تعلیمی مسلک کل کی طرح آج بھی بامعنیٰ ہے، لیکن یہ نصاب ہمارے فن کے لیے اُسی وقت مفید ہوگا، جب اس کی تعلیم فنی ضرورتوں کے مطابق ہو اور طبی نصاب میں جدید مضامین کی شمولیت کے مقاصد کو تعلیم و تعلّم کے دوران پیش نظر رکھا جائے اور طب مغرب سے استفادہ کے سلسلے میں اخذ و قبول کی حدوں کو متعین کیا جائے اور استفادہ کے طریقے مقرر کرتے ہوئے اس کی جہتوں اور سمتوں کا تعین کر لیا جائے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ اجملِ اعظم، انتظار حسین، ناشر یادگارِ اجمل گلبرگ، لاہور، طبع اوّل 1995ء

2۔ آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج کی سہ سالہ رپورٹ (1918ء تا 1920ء) جو مہاتما گاندھی کے سامنے کالج کی عمارت کی رسم افتتاح کے موقع پر 13 فروری 1921ء کو پڑھی گئی، طباعت غنی المطابع، دہلی

3۔ تذکرۂ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی، ناشر ناظم مشیر الاطباء و چشمہ زندگی، حویلی کابلی مل، لاہور، 1928ء

4۔ تذکرۂ خاندانِ عزیزی، حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعت دوم، 2009ء

5۔ تذکرۃ الخوجگان، حکیم خواجہ احسان اللہ، شائع کردہ یونانی شفاخانہ، لشکر، 1941ء

6۔ جمالستان، لاہور (اجمل اعظم نمبر)، جلد 2، شمارہ 9، اپریل 1991ء

7۔ حیاتِ اجمل، شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں، عالمی اردو مرکز، دہلی، اشاعت دوم 2002ء

8۔ حیاتِ اجمل، قاضی عبدالغفار، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1950ء

9۔ سیرتِ اجمل، حکیم جمیل خاں، شائع کردہ ہندوستانی دواخانہ، دہلی، غیر مورخ

10۔ شمع صحت، حیدرآباد (اجمل اعظم نمبر)، جلد 3، شمارہ 2، دسمبر 1963ء، مقامِ اشاعت دفتر ماہنامہ شمع صحت، اعظم طبیہ کالج، حیدرآباد، پاکستان

11۔ قانونِ عصری، حکیم الیاس احمد خاں، جید برقی پریس، دہلی، 1931ء

مدرسہ طبّیہ دہلی

مدرسہ طبّیہ ہندوستان میں طبّی تعلیم کا اوّلین ادارہ ہے۔ اس کے قیام سے پہلے یہاں باقاعدہ کوئی طبّی درس گاہ نہیں تھی۔ حصولِ طب کا کسی قدر ذریعہ اس عہد کے مدارس میں پڑھائی جانے والی طبّی کتابیں تھیں یا طب کی باقاعدہ تعلیم اور عملی مشق کے لیے طلبہ نامور اطباء کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

مدرسہ طبّیہ کے قیام سے پہلے دہلی میں شریف خانی مطبوں کو مرجعیت کا درجہ حاصل تھا۔ یہی طریقہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی رائج تھا، مگر اس تعلیمی نظام کا دائرہ نہایت محدود تھا۔ محض کچھ کتابوں کے درس اور کسی قدر مطب کی مشق پر یہ سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ مزید برآں اس سے صرف خاندان کے افراد یا مخصوص تلامذہ ہی مستفید ہو سکتے تھے۔

حکیم محمود خاں کے مطب میں بھی طبّی تعلیم کا اہتمام تھا۔ وہ خود طلبہ کو درس دیتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے بڑے بیٹے حکیم عبدالمجید خاں کی علمی لیاقت اور فنی ذوق کو دیکھتے ہوئے طلبہ کو پڑھانے کی ذمہ داری انہیں بھی تفویض کر رکھی تھی۔

حکیم عبدالمجید خاں نے تعلیم کے اس روایتی طریقہ کو منظم اور مربوط کرنے کی غرض سے 'مدرسہ طبّیہ' کی بنیاد ڈالی اور گلی قاسم جان میں ایک مکان کرایہ پر لے کر اس کا باقاعدہ آغاز کیا۔ 'مدرسہ طبیہ' کے قیام کے وقت حکیم محمود خاں، نواب عبداللطیف خاں کے علاج کے لیے کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ حکیم عبدالمجید خاں نے اس کے قیام کی اطلاع دیتے ہوئے انہیں لکھا تھا:

"دست بستہ گزارش است کہ فدوی مدرسہ طبّیہ توکل علی اللہ جاری کردہ است"۔

یہ خط 1308ھ مطابق 1890ء میں لکھا گیا ہے۔

اس مدرسہ کی ابتداء 1883ء میں ہوئی، مگر باقاعدہ افتتاح 23 جولائی 1889ء کو ہوا۔ ڈپٹی کمشنر دہلی کے ہاتھوں اس کا افتتاح عمل میں آیا۔ حکیم عبدالمجید خاں نے جماعتوں کے قواعد و ضوابط وضع کر کے الگ الگ سشن مقرر کیے اور کتابوں کے نام کے بجائے جدید طرز پر درجات کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتداءِ شوال سے لے کر آخرِ شعبان تعلیمی میقات قرار پائی۔

'مدرسہ طبّیہ' میں فارسی اور عربی کی دو الگ جماعتیں قائم تھیں اور مدتِ تعلیم دو سال تھی، پھر یہ بڑھا کر تین سال کر دی گئی۔ وقتاً فوقتاً نصاب میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ حکیم عبدالمجید خاں، حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔ فارسی کی تمام کتابیں حکیم جمیل الدین پڑھاتے تھے۔ حکیم محمد احمد خاں مدرسہ طبّیہ میں کلیاتِ نفیسی اور شرحِ اسباب کے استاذ رہے اور حکیم واصل خاں کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک اعلیٰ جماعت کے طلبہ کو درس دیا۔

حکیم عبدالمجید خاں کی یہ طبّی تحریک سرسید کی تعلیمی تحریک کی معاصر ہونے کے ساتھ بالکل اس کے شانہ بہ شانہ بڑھ رہی تھی۔ 1892ء میں جب دہلی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ساتواں اجلاس ہوا تو حکیم اجمل خاں اس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ کانفرنس کے اجلاس میں نواب سعید الدین احمد خاں نے ایک تجویز رکھی کہ 'مدرسہ طبّیہ' کو دارالعلوم، علی گڑھ کی شاخ بنا دیا جائے، مگر یہ منظور نہیں ہو پائی۔

'مدرسہ طبّیہ' کے قیام کا اہم مقصد تعلیمی تنظیم کے ذریعہ یونانی طب کو روایتی خول سے باہر نکالنا تھا۔ دراصل 1857ء کے سانحہ کے بعد پیدا ہونے والے حالات میں یونانی طب کا روایتی وجود اندیشوں کے دائرہ میں تھا، لہٰذا تعلیمی تنظیم کا داعیہ یہ تھا کہ یونانی طب کو ایسا اسلوب عطا کیا جائے، جو جدید علمی دنیا کے لیے قابلِ فہم ہو۔ اس کی تکمیل کے لیے یونانی طب کو نئے تعبیراتی اسلوب میں پیش کیے جانے کی ضرورت تھی۔ ایک اہم تقاضا یہ بھی تھا کہ طلبہ اپنے فن کے ساتھ مغربی طب سے اس قدر واقف ہوں کہ طبّی میدان میں ہو رہی نت نئی دریافتوں سے استفادہ کر سکیں۔ اس ضرورت کے تحت 'مدرسہ طبّیہ' میں مغربی طب کی تعلیم کو شروع سے اہمیت دی گئی تھی۔

حکیم اجمل خاں نے 'اکمل الاخبار' میں اس کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

"یہاں طلبہ کے لیے ڈاکٹری کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور نعشوں کی تشریح

اور مختلف قسم کے آپریشن دیکھنے کے لیے سول ہسپتال سے اجازت حاصل کرلی گئی ہے اور ہسپتالوں کی حاضری کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ علم طبیعی اور جدید سائنس کے لکچروں کو سننے اور طبعیات کے تجربے دیکھنے کا بھی ذریعہ پیدا کیا گیا ہے"۔

حکیم عبدالمجید خاں، حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں نے 'مدرسہ طبیہ' میں تعلیم کا جو منہج اختیار کیا، اس کے محرک وہ مخصوص عوامل تھے جو مغربی علوم وفنون اور نظام تعلیم کی آمد کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ شریفی خاندان نے بدلتے تقاضوں، طب کی تعلیمی بدحالی اور فنی پسماندگی کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اور انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ محض قدیم طبی سرمایہ کی تعلیم پر تکیہ ناکافی ہے۔ اس لیے 'مدرسہ طبیہ' کے بانیان اس بات کے حامی تھے کہ طلبہ اپنے اسلاف کی روایات اور ان کے عظیم ورثہ کی پاسبانی کے ساتھ بقدر ضرورت جدید طبی سائنس سے بھی واقف ہوں، تاکہ قدیم صداقتوں کو جدید زاویوں سے پرکھنے کے لائق ہوسکیں۔

حکیم اجمل خاں 'مدرسہ طبیہ' کو محض تعلیم گاہ کے بجائے، طب کی ایک تحریک سمجھتے تھے۔ اس کے تحریکی دائرہ کو وسیع کرنے کے لیے ایک ایسے آرگن کی ضرورت تھی، جو حلقہ اطباء سے رابطہ کا ذریعہ ہو۔ 1902ء میں حکیم اجمل خاں رامپور سے دہلی آئے تو 'مجلّہ طبیہ' کے نام سے ایک آرگن جاری کیا۔ یہ ایک ماہانہ رسالہ تھا، جس میں مدرسہ کی خبروں کے علاوہ طبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

1911ء میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقع پر نواب صاحب رامپور کے قائم مقام کی حیثیت سے انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر فرانس، جرمنی، اسٹریلیا اور ترکی کی بھی سیر کی اور اُنہوں نے ان ممالک میں طب کی ترقیوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ یہاں کے مشاہدات سے جو تجربے حاصل کیے تھے، اس کی روشنی میں طبِ قدیم کی اصلاح وتجدید اور ترقی کے لیے انہوں نے 'مدرسہ طبیہ' میں بہت سے اقدامات کیے۔ مسیح الملک کا یہ سفر طبی ریفارم کے حوالہ سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

اس سفر سے واپسی پر مسیح الملک نے 'مدرسہ طبیہ' کی توسیع اور اس کے تعلیمی نظام کو جدید اسلوب عطا کرنے کا ایک وسیع منصوبہ تیار کیا۔ 15 اکتوبر 1912ء کو انجمن طبیہ کے سالانہ جلسہ میں ایک مفصل رپورٹ پیش کی، اس میں انجمن کے ممبران کے سامنے اپنے توسیعی عزائم کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

"مدرسہ طبیہ کی تاسیس کے جو مقاصد تھے وہ مدرسہ طبیہ سے پورے نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ان کی تکمیل کے لیے ایک ایسی درس گاہ کی ضرورت ہے، جس سے یونانی اور ویدک کی مکمل تعلیم کا مقصد حل ہو سکے۔ جس میں طلبہ کو نہ صرف کتابی، بلکہ عملی طبی تعلیم دی جا سکے اور اس درس گاہ سے ایسے فارغین نکلیں جو یونانی اور ویدک کی نہایت اعلیٰ اور مکمل تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ جراحی اور ڈاکٹری کے مسلمہ مفید حصہ تک دسترس رکھتے ہوں۔ جنھیں انسانی مشین کے متعلق قدیم اطباء کے اقوال ہی یاد نہ ہوں، بلکہ انہیں خود اس کی بصیرت حاصل ہو"۔

'مدرسہ طبیہ' کو کالج کی شکل عطا کرنے کے منصوبہ کا یہ پہلا اظہار تھا۔ 'مدرسہ طبیہ' کو کالج کا درجہ دینے کے منصوبہ کو نواب رامپور کی تائید اور تعاون حاصل تھا۔ 13 فروری 1921ء کو کالج کی بلڈنگ کی رسم افتتاح کے موقع پر مسیح الملک نے کالج کی سالانہ رپورٹ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

"مجھے اس موقع پر ہز ہائنس جناب نواب صاحب والی ریاست رامپور کا ذکرِ خیر کرنا چاہئے، جنھوں نے سب سے پہلے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ طبی اسکول کو کالج بنا دیا جائے اور موجودہ ضروریاتِ طب کو پیش نظر رکھ کر کالج کے لیے ایک وسیع عمارت تعمیر کی جائے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے ان بارہ سو روپیہ کے علاوہ جو وہ پہلے سے عطا فرما رہے تھے، پچاس ہزار روپیہ کی گراں قدر رقم عطا فرمائی"۔

مسیح الملک کے اس توسیعی منصوبہ کے لیے 'مدرسہ طبیہ' کی قدیم عمارت ناکافی تھی، لہٰذا اُنھوں نے قرولباغ میں ایک وسیع قطعۂ آراضی خریدنے کا منصوبہ بنایا۔ چیف کمشنر نے اس زمین کی جو قیمت مقرر کی وہ بہت زیادہ تھی، مگر لارڈ ہارڈنگ کے ایما پر کمشنر نے یہ زمین حکیم صاحب کو ان کے حسب منشا عطا کی۔

مسیح الملک کی دعوت پر 19 مارچ 1916ء کو لارڈ ہارڈنگ نے قرولباغ میں کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کی تعمیر پر اس وقت سات آٹھ لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔

رسم تاسیس کے موقع پر حکیم اجمل خاں نے وائس رائے لارڈ ہارڈنگ کی خدمت میں ایڈرس پیش کر کے کالج کے نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''گو کہ ہمارے ملک میں ویدک اور یونانی کی تعلیم پرائیویٹ طریقہ پر ہو رہی ہے اور کئی مدرسے ان علوم کی اشاعت کر رہے ہیں، لیکن ان کے معیار تعلیم کو بلند کرنے اور مغربی طب کے بعض ضروری حصوں سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے ہم کو ضرورت تھی کہ ہم ایک ایسا کالج بنائیں، جو ہماری ضرورتوں کے لیے کافی ہو سکے اور جس میں باقاعدہ دیسی طب کی تعلیم اناٹومی اور سرجری کے ساتھ دی جائے''۔

حکیم رشید احمد لکھتے ہیں:

''کالج کی اس پر شکوہ عمارت کو دیکھ کر سر آغا خاں نے کہا تھا کہ یہ کالج ہندوستان کا نہیں، بلکہ یورپ کا طبی کالج معلوم ہوتا ہے''۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

''جب کالج کے افتتاح کا وقت آیا تو ترکِ موالات کا زمانہ تھا، لہٰذا حکیم صاحب نے وائس رائے کے بجائے گاندھی جی کے ہاتھوں یہ رسم انجام دلوائی۔ اگر اس وقت حکیم صاحب وائس رائے کو افتتاح کی دعوت دیتے تو یہ دعوت بخوشی منظور کر لی جاتی اور امید تھی کہ کالج کے لیے پانچ لاکھ روپے نقد اور پانچ ہزار روپیہ ماہانہ اعانت کا اعلان ہو جاتا اور حکومت کے اس قدام کے بعد ہندوستان کی ریاستوں سے گرانقدر اعانتوں کی توقع تھی اور کالج کے فارغین کی حکومت کی نگاہ میں زیادہ وقعت ہوتی''۔

13 فروری 1921ء کو گاندھی جی کے ہاتھوں اس عمارت کا افتتاح عمل میں آیا۔ مسیح الملک نے افتتاحی تقریب میں نواب رامپور، سیٹھ جمال رنگون، مہاراجہ پٹیالہ، بیگم بھوپال، مہاراجہ گوالیار، مہاراجہ اندور اور سلطان رئیس دہلی کا بطور خاص شکریہ ادا کیا۔ اس عمارت کے لیے سیٹھ جمال رنگون نے پچاس ہزار کی رقم خود پیش کرنے کے علاوہ دوسرے لوگوں سے چندہ دلوایا تھا۔ ان کی کوششوں سے رنگون سے ڈھائی لاکھ کا چندہ ہوا تھا۔

1912ء میں مسیح الملک نے 'مدرسہ طبیہ' کو کالج میں تبدیل کرنے کی اسکیم تیار کی اور اس میں طبی تعلیم کے متوازی ویدک تعلیم کا بھی اہتمام کیا۔ 1914ء سے یہاں آیورویدک تعلیم کا آغاز ہوا۔ ساتھ ہی بورڈ آف ٹرسٹیز میں ہندوؤں کو کافی تعداد میں شامل کیا۔ ممکن ہے کہ کالج سے آیوروید اور ہندوؤں کو جوڑنے کے پیچھے کچھ سیاسی مصلحتیں بھی رہی ہوں۔ اس زمانہ میں مسیح الملک سیاست سے وابستہ ہو چکے تھے اور وہ سیاسی دنیا میں سیکولر شبیہ کے حامل سمجھے جاتے تھے، لہٰذا طبیہ کالج سے آیوروید اور ہندوؤں کو جوڑ کر اپنی سیاسی امیج اور تعلیمی مشن میں سیکولر رنگ پیدا کرنا چاہ رہے ہوں۔ ایک ممکنہ وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں تحریکِ آزادی کا بگل بج چکا تھا اور دیر سویر ملک کو آزاد ہونا تھا۔ آزادی کے بعد قائم والے جمہوری نظامِ حکومت میں مسلمان اس ملک میں اقلیت میں ہوتا۔ ان حالات میں یونانی طب کو بہر کیف آیوروید کے تابع ہونا تھا۔ مسیح الملک کی دور رس سیاسی بصیرت نے آنے والے حالات کا اندازہ کر لیا تھا اور اس کی پیش بندی کے طور پر پہلے ہی آیوروید اور یونانی کو جوڑنے کی تدبیر کر لی تھی، لیکن آیوروید اور ہندوؤں کو اس ادارہ سے جوڑنے کی اس وقت بظاہر وجہ یہ تھی کہ میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن اور دیسی طبوں کے حقوق کے تحفظ اور بازیابی کے لیے مشترکہ جدوجہد کی ضرورت تھی، اس لیے ویدوں اور ہندوؤں کو ساتھ لینا ضروری تھا۔

مسیح الملک نے سیاحتِ فرنگ کے بعد طبی نصاب کی اصلاح اور تجدید و تدوین کے مسائل کی طرف خاص توجہ فرمائی اور عملی اقدامات کیے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم قدم اٹھاتے ہوئے اُنہوں نے یونانی اور ویدک دونوں کے نصاب میں فزیالوجی اور کیمسٹری کی تعلیم کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کیا۔ ان کے اس اقدام سے طلبہ میں شورش بھی پیدا ہوئی، مگر انہوں نے اسے تدبیر کے ساتھ فرو کر دیا۔

مسیح الملک کا خیال تھا کہ اجنبی اور غیر مانوس زبان میں تعلیم سے طلبہ پر دوہرا بوجھ پڑتا ہے اور فنی مسائل کے ساتھ لسانی پیچیدگیوں کو سلجھانے میں ایک مدت صرف ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ ایسی زبان میں تعلیم کے حامی تھے، جو طلبہ کے لیے مانوس ہو، لہٰذا انہوں نے اردو کو تعلیمی زبان کا درجہ دیا اور اردو میں درسیات کی تیاری کے لیے اہتمام اور عملی اقدام کیے۔

مسیح الملک کے ذہن میں کالج کی بابت نہایت وسیع منصوبے تھے۔ وہ اس کے کردار کو صرف درس گاہ تک محدود رکھنے کے بجائے، ایک مرکزی ادارہ بنانا چاہتے تھے۔ اُن کی کوشش تھی کہ یہ ہندوستان میں طب کا پالیسی ساز ادارہ بنے اور ایک مرکز کے طور پر طبی تعلیم کے میدان میں قیادت کے فرائض ادا کرے۔ اس کالج کو دوسری تعلیم گاہوں کے لیے ماڈل اور نمونہ بنانے اور اسے طبی دنیا میں رہنما اور مشعل بردار کا مرتبہ عطا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ یہ اس وقت کے تعلیمی مسئلوں کا حل پیش کرتا اور قائدانہ اہلیت کا ثبوت دیتا۔ اس عہد کا سب سے اہم مسئلہ تعلیمی نصاب تھا۔ حکیم اجمل خاں نے وقت کے اس داعیہ کو محسوس کرتے ہوئے جولائی 1926ء میں کالج سے ملحق شعبۂ تحقیقات کی بنیاد ڈالی اور علمی و عملی تحقیقات، اس کا مطمحِ نظر قرار پائیں۔ مسیح الملک چاہتے تھے کہ علمی شعبہ میں طب کے ماہرین، قدیم نصاب پر جدید معلومات کی روشنی میں تنقید و تنقیح کریں اور طب کا ایک بہتر نصاب تیار کریں۔ اس غرض کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی، جس کے ساتھ وہ خود بھی کام کرتے تھے۔ حالانکہ اس زمانہ میں وہ رامپور اور مسوری میں مقیم تھے، مگر کمیٹی کے اجلاس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔

مسیح الملک نے مسوری کے زمانۂ قیام میں علمی شعبہ کے اراکین کو پابندِ عہد کرنے کے لیے ایک عہد نامہ لکھ کر اس پر کمیٹی کے دستخط لیے۔ دستخط کنندگان میں حکیم اجمل خاں، حکیم الیاس خاں، حکیم کبیر الدین، حکیم فضل الرحمٰن، حکیم عبدالحفیظ اور ڈاکٹر سید ناصر عباس کے نام شامل ہیں۔

تحقیقات کا دوسرا شعبہ ادویہ سے متعلق تھا۔ حکیم اجمل خاں چاہتے تھے کی یونانی مفردات کا جدید سائنسی تناظر میں مطالعہ کیا جائے اور ادویۂ معلومہ کی فہرست میں نئے مفردات کا اضافہ کیا جائے اور مرکبات کو تحلیل و تجزیہ کے ذریعہ پرکھ کر، حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں ان کی اصلاح کی جائے۔ اس کے لیے ایک ماہرِ فن کی ضرورت تھی، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی جو جرمنی سے تربیت حاصل کر کے آئے تھے، ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے شعبۂ تحقیقات میں مامور ہوئے۔

اس شعبہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ یونانی ادویہ میں ایسی اصلاح کی جائے کہ ان کی خصوصیات تو برقرار رہیں، لیکن ان میں ندرت پیدا ہو جائے اور وہ موجودہ سائنٹفک دنیا میں قبولیت کا مرتبہ حاصل کر سکیں۔

کالج اور اس کے ذیلی شعبوں کے انتظامی امور، شریفی خاندان کے کسی فرد کے بجائے 'انجمن طبّیہ' نام کی مجلسِ منتظمہ کے سپرد تھے۔ حکیم اجمل خاں اس کے صدر تھے۔ جب انجمن کی جگہ بورڈ آف ٹرسٹیز قائم ہوا تو وہ اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ان دونوں عہدوں کے اختیارات یکساں تھے۔ بورڈ کا سکریٹری منتخب ہونے کے بعد حکیم اجمل خاں کو انتظامی امور میں معاونت کے لیے ایک جوائنٹ سکریٹری کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اس عہدہ پر پیرزادہ محمد حسین (سابق سشن جج) کو ایک معقول مشاہرہ پر مامور کیا۔

12 اگست 1911ء کو دفعہ 21، 1860ء کے تحت 'انجمن طبّیہ' کا رجسٹریشن ہوا۔ 15 اکتوبر 1915ء کو یہ انجمن 'دی بورڈ آف ٹرسٹیز آف دی آیورویدک اینڈ یونانی' کے نام سے موسوم ہوئی اور انجمن کے اختیارات، منصبی فرائض اور اس کی تحویل کی تمام جائدادیں بورڈ کے ٹرسٹیوں کے حق میں منتقل کر دی گئیں۔ بورڈ نے 35 ٹرسٹیوں پر مشتمل ایک منتظمہ کمیٹی تشکیل دی، جس میں حکیموں اور ویدوں کی تعداد مساوی رکھی گئی تھی۔

مختلف شعبوں کی نگرانی اور ان کے انتظام و انصرام کے لیے مندرجہ ذیل چھ کمیٹیاں قائم کی گئیں:

1۔ سب کمیٹی برائے ہندوستانی دواخانہ
2۔ سب کمیٹی برائے رسائن شالہ
3۔ تعلیمی سب کمیٹی
4۔ سب کمیٹی ہسپتال
5۔ سب کمیٹی برائے تعمیرات و اسٹور
6۔ ریسرچ (علمی و عملی) سب کمیٹی

کالج کی ریسرچ سب کمیٹی میں حکیم محمد احمد خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، نواب ابوالحسن خاں، لالہ رام پرشاد، سردار مہتاب سنگھ، ڈاکٹر سید محمد جنید قریشی، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، قاضی عبدالغفار، حکیم محمد الیاس خاں، حکیم محمد ظفر احمد خاں، پنڈت ہری رنجن ممبر تھے۔

دسمبر 1927ء میں مسیح الملک کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حکیم محمد جمیل خاں بورڈ

آف ٹرسٹیز کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ حکیم محمد احمد خاں سے اختلاف کی وجہ سے انتظامی کشمکش کا سلسلہ رہا اور تقریباً ایک ماہ تک ان کے خلاف کالج میں اسٹرائک رہی۔ 1929ء میں انہیں اس عہدہ سے علاحدہ کر کے بورڈ نے حکیم محمد احمد خاں کو سکریٹری مقرر کیا۔ 1937ء میں حکیم محمد جمیل خاں دوبارہ سکریٹری بنے اور 1949ء تک طبیہ کالج ان کے زیر نگرانی رہا۔ 10 اکتوبر 1949ء کو حکومت نے جمیل خاں کی جگہ کالج پر ریسیور مقرر کر دیا۔

1952ء میں دہلی اسمبلی نے طبیہ کالج ایکٹ منظور کیا۔ اس کے مطابق 27 اپریل 1953ء کو طبیہ کالج بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ کرنل بشیر حسین زیدی طبیہ کالج بورڈ کے پہلے چیرمین بنائے گئے۔ بورڈ کے قیام کے بعد کالج کے انتظام میں کسی قدر سدھار ہوا، لیکن 1963ء سے پھر بدانتظامی شروع ہوگئی اور یہ سلسلہ چھ سال تک قائم رہا۔ 1967ء میں ہردیال دیوگن طبیہ کالج بورڈ کے چیرمین منتخب ہوئے، انہوں نے بدنظمی کے دور سے کالج کو نکالنے کی کوشش کی۔ 1963ء میں حکومتِ ہند کے ذریعہ ویاس کمیٹی کی تشکیل ہوئی، اس نے طبیہ کالج کے نصاب کو مفید اور موثر بنانے کے لیے کئی اہم تبدیلیاں کیں۔ حکومت کے سرکلر سے ایک نیا نصاب جاری ہوا۔ سابقہ نصاب کی طرح اس کی مدتِ تعلیم پانچ سال تھی۔ ہائر سکنڈری داخلہ کی اہلیت قرار پائی، جس میں سنسکرت اور عربی داں طلبہ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ 1970ء میں کالج کی طرف سے مستقبل کے لائحۂ عمل کے تحت حکومت کو ایک تین نکاتی اسکیم ارسال کی گئی تھی، اس میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا منصوبہ بھی شامل تھا۔

اس کالج میں پی جی تعلیم کا منصوبہ 1970ء سے تھا، مگر یہ اسکیم بہت دیر سے روبہ عمل ہوئی اور شروع ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد کالج میں اساتذہ کی مطلوبہ تعداد اور ضروری انفرااسٹرکچر کی کمی جیسے مسائل سے دوچار ہو کر التواء کا شکار ہوگئی۔

یہ کالج برطانوی عہدِ حکومت میں قائم ہونے والا طبی تعلیم کا پہلا ادارہ تھا۔ اس نے طبی تعلیم کے میدان میں جو نقوش ثبت کیے تھے وہ اتنے دوررس اور دیرپا تھے کہ اس عہد کے دوسرے تعلیمی اداروں میں اس کی تقلید کی گئی اور نصابِ تعلیم کے حوالے سے اس کے قائم کردہ خطوط کی اب تک پیروی کی جارہی ہے، لیکن 1927ء کے بعد اس کالج پر انحطاط کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اب تک قائم ہے۔ اس کالج نے اپنے قیام کے ابتدائی زمانہ میں طبی تعلیم کے میدان میں رہنمائی

اور مشعل برداری کا کردار ادا کیا تھا، مگر روشن ماضی کا یہ واقعہ اب محض ایک یاد بن کر رہ گیا ہے۔ اس وقت یہ ادارہ صوبہ دہلی کے زیرِ انصرام ہے اور اس کی وہی حالت ہے جو ہندوستان میں دوسرے صوبائی سرکاری اداروں کی ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ اجملِ اعظم، انتظار حسین، ناشر یادگار اجمل، گلبرگ، لاہور، 1995ء

2۔ اے جرنی آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن، شائع کردہ سی سی آر یو ایم، نئی دہلی، 2005ء

3۔ آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج کی سہ سالہ رپورٹ (1918ء تا 1920ء) جو مہاتما گاندھی کے سامنے اس کی رسم افتتاح کے موقع پر 13 فروری 1921ء کو پڑھی گئی، مطبوعہ غنی المطابع، دہلی

4۔ بیاضِ اجمل، انور علی دہلوی، (آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج کی سالانہ رپورٹ، پیش کردہ برہم دت شرما بتاریخ 29 مارچ 1970ء) پیش کش آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج، بورڈ

5۔ تذکرۃ الخواجگان، حکیم خواجہ احسان اللہ، شائع کردہ یونانی شفاخانہ، لشکر، 1941ء

6۔ تذکرہ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی، ناشر ناظم مشیر الاطباء و چشمۂ زندگی، حویلی کابلی مل، لاہور، 1928ء

7۔ حکیم اجمل خاں، حکیم کوثر چاند پوری، نسیم بکڈپو، لکھنؤ، 1973ء

8۔ حیاتِ اجمل، حکیم رشید احمد خاں، عالمی اردو مرکز دہلی، اشاعتِ دوم 2002ء

9۔ حیاتِ اجمل، قاضی عبدالغفار، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1950ء

10۔ دستور العمل برائے بورڈ آف ٹرسٹیز آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج دہلی، جو 15 اکتوبر 1915ء کو وضع ہو کر نافذ العمل ہوا، ترمیم شدہ 26 اکتوبر 1925ء

11۔ دلّی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی، دہلی، اشاعتِ ثانی 2011ء

12۔ سیرتِ اجمل، حکیم جمیل خاں، ہندوستانی دواخانہ، دہلی، غیر مورخ

13۔ ماہنامہ حامی الشفا (اجملِ اعظم نمبر) جنوری، فروری 1963ء، مقامِ اشاعت باب الشفاء، میرٹھ

ہندوستانی دواخانہ

یونانی دواسازی کی تاریخ میں ہندوستانی دواخانہ مثالی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ اس دور کی یادگار ہے جب دیسی ادویات کو دیانت اور احتیاط سے تیار کرنے کا کوئی ادارہ نہیں تھا، صرف عطاری کی دوکانیں تھیں، جو شخصی کاروبار کی حیثیت رکھتی تھیں، جہاں پیشہ ورانہ رجحانات کے باعث دیانت داری کا فقدان تھا۔ صحیح اور معیاری دواؤں کی عدمِ دستیابی کے سبب اطباء کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ طبیب کی صحیح تشخیص اور تجویز کے باوجود معالجہ کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہورہے تھے، لہٰذا ایک ایسے ادارہ کی ضرورت تھی، جہاں دیانت داری کے ساتھ نسخوں کے صحیح اجزاء کے مطابق یونانی ادویہ جدید ڈھنگ سے تیار ہوں، جنہیں مطب ومعالجہ میں پورے اطمینان کے ساتھ استعمال کیا جاسکے۔

ان داعیوں کے ساتھ 'ہندوستانی دواخانہ' سے 'مدرسہ طبیہ' کی تعلیمی ضرورتیں بھی جڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے کہ محض درس کے ذریعہ طلبہ کو ادویہ کی زبانی معلومات فراہم کرنا اس وقت تک بے سود تھا، جب تک کہ وہ خود مشاہدہ کرکے ان کی شناخت، اصلی ونقلی مفردات کے درمیان تمیز اور مرکبات کی تیاری کے طریقے وہنر نہ سیکھ لیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے 1903ء میں دواخانہ کی بنیاد ڈالی گئی۔

'مدرسہ طبیہ' کے بانی حکیم عبدالمجید خاں ایک ایسا دواخانہ قائم کرنا چاہ رہے تھے، جہاں طلبہ دواشناسی اور دواسازی کی تعلیم حاصل کرسکیں، لیکن مختلف وجوہ سے وہ اس خیال کو عملی صورت نہ دے سکے۔

حکیم عبدالمجید خاں کے انتقال کے بعد ان کے منجھلے بھائی حکیم واصل خاں نے 'مدرسہ طبیہ'

کی انتظامی ذمہ داریاں سنجالیں۔ اُنہوں نے اپنی جانشینی کے زمانہ میں حکیم اجمل خاں کے ساتھ مل کر دواسازی کی ایک کمپنی کی شروع کی۔

'یونانی اور ویدک میڈیسن کمپنی' کے نام سے قائم ہونے والا یہ ادارہ مشترک سرمایہ سے بنایا گیا تھا۔ اس کمپنی میں شہر کے ممتاز افراد کے حصص تھے۔ حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں کی تحریک پر مرزا اکبر علی خاں رئیس، نواب فیض احمد خاں رئیس، لالہ جگل کشور وکیل، لالہ ہزاری مل جوہری، مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی، شمس العلماء سید احمد شاہی امام جامع مسجد دہلی، میر جمال وغیرہ کے علاوہ دہلی اور بیرون دہلی کے رؤساء اور معززین نے سرمایہ کی فراہمی میں حصہ لیا تھا۔

حکیم واصل خاں کے بعد حکیم اجمل خاں نے ادارہ جاتی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اُنہوں نے کاموں کی تنظیم کے لیے ایک اہم قدم اُٹھایا اور شہر کے ممتاز رؤساء اور اطباء کی ایک انجمن قائم کی اور 'مدرسہ طبیہ' اور اس کے ذیلی اداروں میں جمہوریت کی روح پیدا کرنے کے لیے سارے ادارہ جاتی کام انجمن کو سونپ دیے۔

اداروں کے پھیلتے دائرہ کی وجہ سے مالی ضرورتیں بھی بڑھ رہی تھیں، لہٰذا ان کے بندوبست کے لیے مستحکم مالی ذرائع کی ضرورت تھی۔ مسیح الملک نے 'یونانی اینڈ ویدک میڈیسن کمپنی' کے حصہ داروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے حصص 'مدرسہ طبیہ' کے حق میں فروخت کر دیں، کمپنی کے شرکاء بلا تأمل راضی ہو گئے۔ بعضوں نے اپنا حصہ چھوڑ دیا، جو لوگ قیمت لینا چاہ رہے تھے، انہیں انجمن نے اپنے سرمایہ سے خرید لیا۔ انجمن کی تحویل میں آنے کے بعد 'ہندوستانی دواخانہ' کے نام سے اس ادارہ نے شناخت بنائی۔

'ہندوستانی دواخانہ' میں دواسازی اور انتظامی معاملوں کا ایک مکمل اور جامع نظام تھا۔ دواسازی کے جدید آلات اور سائنٹفک طریقوں سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ دواسازی کے قدیم طریقوں کے محاسن بروئے کار لائے جاتے۔ یہاں دواؤں کی تیاری کے لیے ایسے افراد مامور تھے، جنہیں ادویہ کی شناخت اور تیاری میں مہارت تھی۔ ہر ذمہ داری کے کام پر ماہرین اور تجربہ کار مقرر تھے۔ مجربات اور قیمتی دواؤں کی تیاری خاص نگرانی میں انجام پاتی۔ تیار شدہ دواؤں کا علمی طریقوں پر طبیب کے ذریعہ امتحان کیا جاتا، اگر کسی دواء کی تیاری میں کوئی خامی رہ جاتی یا جن دواؤں کی

مدتِ حیات ختم ہو جاتی، انہیں ضائع کر دیا جاتا۔

مولوی حبیب الرحمٰن رامپوری دواخانہ کے پہلے منیجر تھے۔ میر انوار احمد اور اُن کے والد میر فخر الدین، حکیم اجمل خاں کے بڑے معتمد تھے۔ خاص خاندانی مجربات اور اکسیری و قیمتی ادویات کی تیاری انہیں کے ذمہ تھی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی نگرانی میں خواجہ غلام السبطین اور میر سید جمال الدین نے انتظامی اصلاحات اور دواخانہ کی ترقیات کے سلسلہ میں بڑی اہم خدمات انجام دیں۔

15 اکتوبر 1915ء کو 'دی بورڈ آف ٹرسٹیز آف دی آیورویدک اینڈ یونانی' کی تشکیل کے بعد 'انجمن طبیہ' کے تمام اختیارات اور جائداد بورڈ کے ٹرسٹیوں کو منتقل ہو گئے تو 'ہندوستانی دواخانہ' بھی بورڈ کی تحویل میں آ گیا۔ دواخانہ کے انتظام و انصرام کے لیے 'سب کمیٹی برائے ہندوستانی دواخانہ' قائم کی گئی۔ یہ کمیٹی سات ممبران پر مشتمل تھی، مدن موہن لال، حکیم غلام کبریا خاں، حکیم محمد احمد خاں، قاضی عبد الغفار، لالہ رام پرشاد، ڈاکٹر رام ناتھ ترویدی اور منیجر 'ہندوستانی دواخانہ' اس سب کمیٹی کے ممبر تھے۔

حکیم اجمل خاں تاحیات 'ہندوستانی دواخانہ' کی سرپرستی کرتے رہے۔ ابتداءً وہ 'انجمن طبیہ' کے صدر کی حیثیت سے، پھر بورڈ آف ٹرسٹیز کے سکریٹری کے طور پر انتظامی نگراں رہے۔ چونکہ کالج کا دارومدار دواخانہ کی آمدنی پر تھا، حکیم اجمل خاں یا ان کے خاندان کی سرپرستی کے بغیر دواخانہ کی قدر و قیمت باقی نہیں رہ سکتی تھی، لہٰذا بورڈ کے دستور العمل میں یہ دفعہ رکھی گئی تھی کہ جب تک کالج دواخانہ کی اعانت سے بے نیاز نہ ہو جائے، اس وقت تک انتظامی امور کی ذمہ داری اس خاندان کے افراد کے پاس ہی رہے۔

اس دواخانہ نے بے شمار مریضوں کو فائدہ پہنچانے کے علاوہ 'مدرسہ طبیہ' اور اس کے دوسرے شعبوں کو مضبوط مالی بنیاد فراہم کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا اور ان کے اخراجات کی کفالت میں بڑا تعاون پیش کیا۔ اس دواخانہ نے اعلیٰ اور معیاری دواسازی کا جو نمونہ پیش کیا وہ آج بھی قابلِ تقلید ہے۔ یونانی دواسازی کی موجودہ دنیا میں بھی اس قسم کے اداروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ہمارے عہد میں یونانی طب کی پسماندگی کی جو وجوہ ہیں، ان سب میں بڑی وجہ یہ ہے کہ یونانی فارمیسی کا شعبہ نہایت کمزور اور بدحال ہے اور ایلوپیتھی کی عوامی مقبولیت اور پسندیدگی کا اہم سبب یہ ہے کہ اس نے دواسازی کے میدان میں کمال پیدا کرکے علاج ومعالجہ اور دواؤں کے استعمال کو نہایت سہل بنادیا ہے، جو آج کے زمانہ میں پسند و ناپسند کا بڑا پیمانہ ہے۔ اجمل برادران نے ان داعیوں کو بہت پہلے محسوس کرکے عملی اقدامات کیے تھے، مگر موجودہ طبی دنیا میں یہ شعبہ توجہ سے یکسر محروم ہے۔

حکیم اجمل خاں 'ہندوستانی دواخانہ' کو کافی اُونچائیوں تک لے جانے کا ارداہ رکھتے تھے۔ وہ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں اس کی شاخیں قائم کرکے اس کے دائرہ کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔ اگر انہیں زندگی نے کچھ اور مہلت دی ہوتی تو وہ ایسا ضرور کرتے۔

حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حکیم جمیل احمد بورڈ کے سکریٹری منتخب ہوئے، مگر ان کی سکریٹری شپ کا زمانہ نہایت کشمکش کا تھا اور انتظامی معاملات کو لے کر خاندان کے لوگوں میں بڑی رسہ کشی رہی۔

1929ء سے 1937ء تک حکیم محمد احمد خاں بورڈ کے سکریٹری اور 'ہندوستانی دواخانہ' کے ذمہ دار رہے۔ 1949ء تک کی باقی مدت میں حکیم جمیل احمد خاں بورڈ کے سکریٹری اور 'ہندوستانی دواخانہ' کے نگراں تھے، مگر ان دونوں کے زمانہ میں 'ہندوستانی دواخانہ' ترقی کے بجائے تنزل کا شکار رہا۔

خاندانی اختلافات کے باعث ایک وقت ایسا آیا کہ حکیم محمد احمد خاں نے 'ہندوستانی دواخانہ' کے مقابلہ میں 'دواخانہ حکیم اجمل خاں' کے نام سے ایک ذاتی کمپنی شروع کردی۔ اس سے 'ہندوستانی دواخانہ' کا کاروبار بہت متاثر ہوا اور اسے کافی نقصان پہنچا۔

1949ء کے بعد شریفی خاندان کا تعلق اس دواخانہ سے ختم ہوگیا۔ 1953ء میں طبیہ کالج بورڈ کے قیام کے بعد یہ دواخانہ بورڈ کی تحویل میں آکر دہلی حکومت کے زیر اثر آ گیا۔

اب 'ہندوستانی دواخانہ' ختم ہو چکا ہے۔ اس کی عمارت آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج کے زیر تصرف ہے۔ مرزا غالب کی حویلی کے سامنے گلی قاسم جان میں واقع یہ عظیم ملی میراث

ناخلف ہاتھوں برباد ہو کر عبرت کا ایک نشان بن کر رہ گئی ہے۔ اس وقت اس عمارت میں یونانی، آیورویداور ایلوپیتھی کی او پی ڈی قائم ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج کی سہ سالہ رپورٹ (1918ء تا 1920ء) جو مہاتما گاندھی کے سامنے اس کی رسم افتتاح کے موقع پر 13 فروری 1921ء کو پڑھی گئی، مطبوعہ غنی المطابع، دہلی

2۔ تذکرہ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی، ناشر ناظم مشیر الاطباء و چشمۂ زندگی، حویلی کابلی مل، لاہور، 1928ء

3۔ حیاتِ اجمل، حکیم رشید احمد خاں، عالمی اردو مرکز، دہلی، اشاعتِ دوم 2002ء

4۔ دستور العمل برائے بورڈ آف ٹرسٹیز آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج، دہلی، جو 15 اکتوبر 1915ء کو وضع ہو کر نافذ العمل ہوا، ترمیم شدہ 26 اکتوبر 1925ء

5۔ دلّی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی، دہلی، اشاعتِ ثانی 2011ء

مدرسہ طبّیہ زنانہ

مدرسہ طبیہ اور اس کے ذیلی اداروں میں 'مدرسہ طبیہ زنانہ' کا بڑا امتیاز یہ تھا کہ دوسرے اداروں کا قیام فنی ضرورتوں کے لیے ہوا تھا، لیکن 'مدرسہ طبیہ زنانہ' کے قیام کے محرک سماجی داعیے تھے۔ حکیم اجمل خاں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ بہت سے سماجی معاملات کی طرح عورتیں اپنی صحت کے جائز حقوق سے بھی محروم ہیں اور تہذیب وشرافت جیسے ناموں پر ان کا یہ بنیادی حق بھی سلب کرلیا گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں زچگی کے دوران بڑی تعداد میں وہ لقمۂ اجل بن جاتی ہیں۔ زچہ بچہ کے تمام معاملات ناخواندہ دائیوں کے سپرد ہیں۔ اس افسوس ناک صورت کو دیکھتے ہوئے حکیم اجمل خاں نے ایک زنانہ مدرسہ کے قیام کی تحریک شروع کی۔ ان کی کوشش سے تھوڑے ہی عرصہ میں چالیس ہزار کی خطیر رقم جمع ہوگئی۔ مالی فراہمی کے بعد مسیح الملک نے محلہ چوڑی والان میں ایک وسیع مکان کرایہ پر لے کر ایک زنانہ طبی مدرسہ اور زنانہ طبی شفاخانہ کی شروعات کی۔

مدرسہ طبیہ دہلی کے قیام کے بعد طب کے دوسرے پہلوؤں کی اصلاح وتجدید اور کئی اہم تقاضوں کی تکمیل کے لیے مزید اداروں کے قیام کی ضرورت محسوس کی گئی۔ 'مدرسہ طبیہ' کے دائرہ کو وسیع کرکے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے 'مدرسہ طبیہ زنانہ' کا قیام عمل میں آیا اور یونانی طریقۂ علاج کو ہر سطح پر معاصر تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے علاوہ اسے سماجی داعیوں سے جوڑنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ 13 جنوری 1909ء کو سر لوئی ڈین بہادر لفٹننٹ گورنر، پنجاب کی بیگم کے ہاتھوں اس مدرسہ کا افتتاح ہوا اور یکم مئی 1909ء سے باقاعدہ تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ لیڈی سر لوئی ڈین حکیم اجمل خاں کے اس منصوبہ کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئیں اور انہوں نے حکیم صاحب کے اس جذبہ کو بے حد سراہا۔

کالج کا ایک سال مکمل ہونے پر 16 اپریل 1910ء کو چوڑی والان میں واقع مدرسہ زنانہ وشفاخانہ کے کیمپس میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں مردوں اور عورتوں کے لیے علاحدہ تقریبوں کا انتظام تھا۔ نواب احمد علی خاں بہادر فرمانروا ریاست مالیر کوٹلہ نے مردانہ تقریب کی صدارت فرمائی، زنانہ جلسہ کی صدارت کے لیے مہارانی نرسنگھ گڑھ کا نام طے تھا، مگر طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے وہ تشریف نہیں لاسکیں۔ ان کی جگہ لالہ لال سنگھ کی بیگم نے تقریب کی صدارت کی۔

یہ کالج اپنے طرز کا پہلا ادارہ اور تعلیمی میدان میں ایک نیا تجربہ تھا۔ حکیم اجمل خاں نے یہ تجربہ ایسے دور میں کیا تھا، جب ہندوستان جیسے روایت پسند ملک میں عورتوں کے لیے اس قسم کی پیشہ ورانہ تعلیم تو کجا، عام تعلیم کا تصور بھی بہت کم تھا۔ یہ واقعہ حکیم اجمل خاں کی جدت پسندانہ طبیعت اور انقلابی سوچ کا غماز ہے۔

حکیم اجمل خاں نے 'مدرسہ طبیہ زنانہ' کی بنیاد ڈال کر ہندوستانی مسلمانوں کو عورتوں کے باب میں عام تعلیم سے آگے، عصری تعلیم کی ضرورت کے تئیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جس وقت حکیم اجمل خاں نے زنانہ طبی مدرسہ کی تحریک شروع کی تھی، وہ انہیں جیسا شخص کر سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے احباب کو اس کاز کے لیے آمادہ کر کے دراصل اپنی ذہن ساز صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا۔

ابتداء میں یہ 'مدرسہ دائیان' کے نام سے موسوم تھا۔ کچھ دنوں بعد محسوس کیا گیا کہ اس نام سے اس کی عظمت کا مفہوم متاثر ہو رہا ہے، دائی کے لفظ سے لوگوں کا ذہن اس پیشہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو دائیوں سے منسوب تھا، جسے سماج میں مبتذل سمجھا جا رہا تھا۔ یہ غلط فہمی مدرسہ سے استفادہ کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ لہٰذا ذمہ داروں نے اس کا نام بدل کر 'مدرسہ طبیہ زنانہ' تجویز کیا۔ اس کالج میں لڑکیوں کو یونانی، آیورویدا اور ایلوپیتھی کی نظری اور عملی تعلیم دی جاتی اور زنانہ ہاسپٹل میں بیمار خواتین کا ان تینوں طریقوں سے علاج کیا جاتا، تاکہ طالبات کی عملی تربیت ہو سکے اور خواتین کو علاجی سہولت مل سکے۔

یہاں پڑھنے والی طالبات کی دو جماعتیں تھیں، جماعت 'الف' کا نصاب چار سال پر مشتمل تھا۔ اس مدت میں طالبات کو یونانی اور آیوروید کی تعلیم کے ساتھ جدید طب کے ضروری

مباحث اور شفا خانہ کی عملی مشق کرائی جاتی تھی۔ اس نصاب کی تکمیل کے بعد یونانی طالبات کو 'طبیبہ قابلہ' اور ویدک طالبات کو 'وید دھا نتری' کی سند دی جاتی۔ جماعت 'ب' کا نصاب دو سال پر مشتمل تھا۔ اس جماعت کی طالبات کو زبانی اور عملی طور پر دائی گیری سکھائی جاتی۔ دو سالہ تربیت کے بعد ان طالبات کو 'قابلہ' یعنی دائی کا سرٹیفکٹ دیا جاتا۔ اس جماعت کے لیے ایک رعایت تھی کہ اگر کسی طالبہ کے بارے میں لیڈی ڈاکٹر کو اطمینان ہو جائے کہ اس نے دو سال سے پہلے ہی دائی گیری سیکھ لی ہے تو مقررہ مدت سے پہلے ہی اسے 'قابلہ' کا سرٹیفکٹ مل سکتا تھا۔

زنانہ طبی کالج میں مذہبی تفریق کے بغیر وہ تمام لڑکیاں داخلہ کی اہل تھیں، جو اردو، ہندی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھتی ہوں، شریف الطبع ہوں، جسمانی طور پر صحت مند ہوں اور متعدی امراض میں مبتلا نہ ہوں۔ جو لڑکیاں اردو اور ناگری نوشت وخواند نہیں جانتیں، ان کی تعلیم کے لیے مبادی جماعتیں قائم تھیں، ان میں اردو و ناگری کی تعلیم کے لیے دو استانیاں مامور تھیں۔

اس کالج کے یونانی شعبہ میں تعلیم کی زبان اردو تھی، مگر اس زبان میں درسی ضرورت کی سلیس اور عام فہم کتابیں دستیاب نہیں تھیں، حکیم اجمل خاں کی ہدایت پر ان کے شاگرد حکیم عبدالرزاق نے لڑکیوں کا نصاب تیار کیا۔ وہ اس کالج میں استاذ بھی تھے۔ مدرسہ میں پردہ کے نظام کی وجہ سے، وہ پردہ کی اُوٹ سے لڑکیوں کو تعلیم دیتے تھے۔

زنانہ طبیہ کالج ایک اقامتی ادارہ تھا، جہاں لڑکیوں کی اخلاقی تربیت اور نگرانی کے لیے لیڈی منصرمہ کا انتظام تھا۔ کالج کے ذمہ داروں نے طالبات کے مذہبی احساسات کی رعایت کرتے ہوئے ہندو اور مسلم لڑکیوں کے قیام وطعام کا علاحدہ بندوبست کیا تھا۔

1928ء کے پراسپیکٹس میں شائع تعلیمی اور انتظامی اسٹاف کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حکیم محمد جمیل خاں انتظامی بورڈ کے سکریٹری اور خواجہ غلام السبطین جوائنٹ سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر سید ناصر عباس پرنسپل، حکیم مولوی محمد حفیظ الرحمان وائس پرنسپل، پنڈت گنگا سہائے پروفیسر ویدک تھے۔ ڈاکٹر شریف النساء خانم لیڈی ڈاکٹر کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ایلوپیتھی مضامین کی تدریس پر مامور تھیں۔ مسرت جہاں بیگم یونانی کی معلمہ تھیں۔ سلطان جہاں بیگم بورڈنگ ہاؤس کی منصرمہ تھیں۔ ملکہ بیگم کمپاؤنڈر اور منشی اصغر علی دفتر کے محرر تھے۔

1928ء کا پراسپیکٹس اس زمانے کا ہے، جب حکیم اجمل خاں کے بعد ان کے بیٹے حکیم محمد جمیل خاں مجلسِ منتظمہ کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ یہ پراسپیکٹس حکیم اجمل خاں کی حیات 1918ء کا مرتبہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح الملک کی وفات کے بعد نئے ذمہ داروں نے مسیح الملک کے قائم کردہ خطوط پر ہی تعلیمی نظام کو جاری رکھا۔

زنانہ طبیہ کالج میں منعقد 24 فروری 1935ء کی کانوکیشن تقریب میں مسز محمود وائس پرنسپل زنانہ طبیہ کالج نے جو رپورٹ پیش کی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیگم میاں محمد رفیع سکریٹری لیجسلیٹو اسمبلی کے ہاتھوں کامیاب طالبات کو اسناد عطا کی گئیں، بیگم صاحبہ اس تقریب کی صدر تھیں۔

حکیم اجمل خاں، اُن سے پہلے اُن کے برادران اور اُن کے بعد اُن کے بیٹے حکیم محمد جمیل خاں کے زمانۂ انصرام میں یہ روایت رہی کہ اس خاندان کے قائم کردہ اداروں کی تقریبات میں ملک کی نامور سماجی اور سیاسی شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا تھا، غالباً اس کا مقصد طبّی کاز سے حلقۂ خواص کو جوڑنا تھا اور یہ اس عہد کی بڑی اہم ضرورت تھی۔

مطالعاتی ماخذ

1۔ حیاتِ اجمل، حکیم رشید احمد خاں، عالمی اردو مرکز، دہلی، اشاعت دوم 2002ء

2۔ تذکرہ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی، ناشر ناظم مشیر الاطباء و چشمۂ زندگی، حویلی کابلی مل، لاہور، 1928ء

3۔ مدرسہ طبیہ زنانہ و شفاخانہ زنانہ دہلی کے پہلے سالانہ جلسہ کی رپورٹ جو 16 اپریل 1910ء کو پیش کی گئی تھی، شائع کردہ مطبع مجتبائی

4۔ پراسپکٹس شعبہ زنانہ (مرتبہ اگست 1918ء)، شائع کردہ قیصر ہند پریس، دہلی، جون 1928ء

5۔ رپورٹ زنانہ طبیہ کالج، جسے کالج کانوکیشن کے موقع پر 24 فروری 1935ء کو مسز محمود وائس پرنسپل نے پیش کیا تھا، مطبوعہ جید پریس، دہلی

برطانوی عہد میں طبّی نظامِ تعلیم

1857ء میں ہندوستان ایک ایسے انقلاب سے گزرا، جس کے اثر سے زندگی کا کوئی شعبہ محفوظ نہیں تھا۔ مغل سلطنت کا سقوط ہوا اور ہندوستان کی زمامِ اقتدار تاجِ برطانیہ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ یہ صرف اقتدار کی تبدیلی نہیں تھی، بلکہ برطانوی استبداد کے بعد اس ملک کے سیاسی نظام کے ساتھ سماجی و معاشرتی رویے، یہاں تک کہ علمی وفنی اسالیب بھی بدل گئے تھے۔ اِن حالات سے یونانی طب بھی دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ پائی۔

1857ء سے پہلے یونانی طب کی تعلیم کا بیشتر معاملہ مدرسوں اور اطباء کے مطبوں سے متعلق تھا۔ اُس وقت مدارس کے نصاب میں جزوی طور پر طبی کتابیں بھی شامل ہوتی تھیں، جن کی تعلیم سے طب کے بنیادی امور سے آگاہی ہو جاتی، پھر ذوق و ذہن کا میلان ہوتا تو اطباء کی خدمت میں حاضر ہوکر، طلبہ طب کی مزید کتابیں پڑھتے اور ان کے مطبوں سے عملی مشق حاصل کر لیتے۔ برطانوی استبداد سے پہلے ہندوستان میں طبی تعلیم کا یہی معروف اسلوب تھا۔ مگر ان کے تسلط کے بعد یہاں طبِ مغرب کی اشاعت کے ساتھ دیسی معالجاتی طریقوں کو غیر علمی اور غیر سائنسی ثابت کرنے کا بڑے پیمانہ پر پروپیگنڈہ کیا گیا تاکہ لوگ اِن سے بدظن ہو کر جائے امان کی تلاش میں مغربی طب کی پناہ میں آجائیں۔

اِن حالات سے نبرد آزمائی کے لیے ایک جامع حکمتِ عملی کی ضرورت تھی۔ فنی اصلاح کے پہلو سے تعلیمی نظام کو عصری مقتضا سے ہم آہنگ کرنا اولین داعیہ تھا، اِس تقاضہ کو محسوس کرنے والوں میں خاندانِ شریفی کا نام سرِ فہرست ہے۔ حکیم عبدالمجید خاں نے اپنے بھائیوں حکیم محمد واصل خاں، حکیم محمد اجمل خاں اور خاندان کے دوسرے اطباء کے اشتراک سے مدرسہ طبیہ کی بنیاد ڈالی۔ اِس مدرسہ کا

قیام ہندوستان میں طبی تعلیم کے حوالہ سے ایک نیا تجربہ تھا۔ اِس کی ابتدا 1883ء میں ہوئی، مگر باقاعدہ افتتاح 23 جولائی 1889ء کو ہوا۔ 1902ء میں مجلہ طبیہ کے نام سے اس کا ایک آرگن جاری کیا گیا۔ 1906ء میں ہندوستانی دواخانہ کی تاسیس عمل میں آئی، علاج ومعالجہ کے لیے معیاری دواؤں کی فراہمی اور طلبہ کی مشق ومزاولت کے ساتھ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اسے 'مدرسہ طبیہ' کے لیے آمدنی کا ذریعہ بنایا جائے۔ تعلیم نسواں کے اہتمام کے لیے جنوری 1909ء میں اِس سے ملحق مدرسہ طبیہ زنانہ کا قیام عمل میں آیا۔

1912ء میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے 'مدرسہ طبیہ' کو کالج میں تبدیل کرنے کی اسکیم تیار کی۔ وہ اسے محض درس گاہ کے بجائے طبی تعلیم کی ایک تحریک کا درجہ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اسی طرز پر اس کی توسیع کے خطوط وضع کیے۔ اس منصوبہ کے لیے 'مدرسہ طبیہ' کی موجودہ عمارت ناکافی تھی، لہٰذا قرول باغ میں ایک وسیع قطعۂ آراضی حاصل کیا۔ اُن کی دعوت پر لارڈ ہارڈنگ نے 9 مارچ 1916ء کو کالج کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا، جس کا گاندھی جی کے ہاتھوں 13 فروری 1921ء کو افتتاح عمل میں آیا۔ تعلیم کے وسیع تر مقاصد تحقیق کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے ہیں، اس ضرورت کے تحت دو جولائی 1926ء کو اس کالج میں علمی اور عملی تحقیقات کے لیے ایک مستقل شعبہ کا قیام عمل میں آیا۔

ہندوستان میں طبی تعلیم کے سلسلے میں 'مدرسہ طبیہ' کے بڑے دوررس اثرات سامنے آئے۔ اس سے تحریک پاکر دوسرے خطوں میں بھی طبی درس گاہوں کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا، جس سے برطانوی عہد میں طبی نظامِ تعلیم کو مربوط اور منظم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ واقعی اِس کالج نے مسیح الملک کی حیات تک طبی دنیا میں قیادت وسیادت کا فریضہ انجام دیا۔

خاندانِ شریفی کے بعد لکھنؤ والوں میں بھی طبی تعلیم کے تعلق سے بیداری پیدا ہوئی چنانچہ دلی کے بعد لکھنؤ یونانی طب کی تعلیم کے باب میں دوسرے بڑے مرکز کے طور پر وجود میں آیا۔ یہاں ایک ہی زمانہ میں تین درس گاہوں کا قیام عمل میں آیا۔ حکیم عبدالعزیز نے جولائی 1902ء میں تکمیل الطب کالج قائم کیا، ان کے بعد حکیم وہاج الحق فرنگی محلی نے 1903ء میں مدرسہ طبیہ وہاجیہ کی بنیاد ڈالی، بعدازاں حکیم محمد حسین رضا نے جنوری 1904ء میں 'منبع الطب' کے نام سے ایک طبی درس گاہ قائم کی۔

خاندانِ شریفی کی طبی تعلیم کی تنظیمی تحریک سے متاثر ہوکر حکیم احمد حسین عثمانی نے 1904ء میں 'الکلیۃ الطبیۃ' کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی، جو اِس وقت اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج الٰہ آباد کے نام سے موسوم ہے۔

بیسویں صدی میں اطباء کی طرف سے تعلیمی بیداری کے مظاہر صوبۂ بہار میں بھی نظر آتے ہیں۔ حکیم سید شاہ محمد حمید فردوسی کا قائم کردہ مدرسہ طبیہ گیا، 1923ء میں گیا میں قائم حکیم سید محمد ابراہیم کی درس گاہ طبیہ وشفا خانہ سنجری اور یکم جنوری 1928ء کو حکیم عبدالرزاق سوہی بہاری کے ذریعہ قائم مدرسہ طبیہ سوہ سرائے پٹنہ، طبی تعلیم کے سلسلے میں اطبائے بہار کی بیداری کے نمونے ہیں۔

برطانوی عہدِ حکومت میں خاندانِ شریفی نے یونانی طب کی تعلیمی تنظیم کی جو تحریک شروع کی تھی، اُس کے اثرات پورے ملک میں نظر آئے، اتر پردیش اور بہار کی طرح شمالی ہند کے دوسرے مقامات پر بھی بڑے پیانے پر اِس سلسلے میں کوششیں ہوئیں۔ پنجاب میں ویدک اینڈ یونانی طبی کالج امرتسر، بھوپندر طبیہ کالج پٹیالہ، اجمل طبیہ کالج امرتسر، مدرسہ طبیہ کپورتھلہ، چھاچھی طبیہ کالج ڈنگہ، دار العلوم طبیہ بٹالہ، راجستھان میں مدرسہ نظامیہ خلیلیہ ٹونک وغیرہ کا شمار برطانوی عہد میں تعلیمی تنظیم کے حوالہ سے اہم مساعی کے طور پر ہوتا ہے۔

جنوبی ہندوستان میں قدوسیہ طبیہ کالج مدراس، اجمل طبیہ کالج بمبئی، یونانی میڈیکل کالج و جناح ہسپتال بمبئی اور متحدہ ہندوستان کے وہ خطے جو 1947ء کی تقسیم سے پہلے ہندوستان کا حصہ تھے، وہاں بھی کئی درس گاہوں کا قیام عمل میں آیا۔ طبیہ کلاسز لاہور، طبیہ کالج حسین آگاہی ملتان، رایل طبیہ کالج ملتان، ایسٹرن اینڈ ویسٹرن میڈیکل کالج لاہور، دار العلوم طبیہ پنجاب لاہور، حبیبیہ طبیہ کالج ڈھاکہ، درس گاہ تعلیم الطب لاہور، سندھ ویدک اینڈ یونانی طبی کالج، یونانی طبیہ کالج سیال کوٹ، شعبۂ طب اسلامیہ کالج پشاور، ویدک اینڈ یونانی طبی کالج سندھ، گورنمنٹ طبی کالج سلہٹ وغیرہ اُس تحریکی اثر کے نتیجہ میں وجود میں آئے تھے، جو مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے 1906 میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے نام سے شروع کی تھی، پھر اس کے زیرِ اثر مقامی سطح پر بہت سی طبی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا۔ اِن میں

سے اکثر طبی درس گاہیں انہیں کے ذریعہ معرضِ وجود میں آئی ہیں۔

سطورِ بالا میں جن اداروں کا تذکرہ ہے، ان میں سے کچھ بہت محدود پیمانہ پر تھے اور کچھ کی مدتِ کارکردگی بہت مختصر رہی، مگر ان سب کی اپنی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ یہ اُس عہد سے تعلق رکھتے ہیں، جب یونانی طب میں تعلیمی تنظیم کا کام ابتدائی مرحلے میں تھا اور یہ نظام مکمل طور پر روایتی خول سے باہر نہیں آسکا تھا، لہٰذا یہ جس صورت میں تھے، اپنے عہد اور زمانہ کے تناظر میں اہم تھے۔

طبی تعلیم کی تنظیم کے سلسلے میں اطباء کی انفرادی مساعی اور طبی تنظیموں کی کوششوں سے جو ادارے وجود میں آئے، ان سے برطانوی عہدِ حکومت میں یونانی طب کے تعلیمی نظام کو استحکام کے ساتھ بڑی وسعت ملی اور طبقۂ عوام کو بھی ان سے مستفید ہونے کا موقع فراہم ہوا، جب کہ ماضی میں رائج تعلیم کے استاذی نظام سے صرف مخصوص طلبہ ہی استفادہ کرسکتے تھے اور وہ بھی محدود صورت میں۔

برطانوی عہدِ حکومت میں یونانی طب کے تعلیمی استحکام کے سلسلے میں اطباء کی بیداری کا اہم سبب یہ تھا کہ طبِ مغرب، جس کی سرپرست خود برطانوی حکومت تھی، اس کی طرف سے عوام میں دیسی طبوں سے بدظنی کے لیے معاندانہ پروپیگنڈے ہورہے تھے۔ مگر دیسی طبوں سے عوامی دلچسپی جڑی تھی، ایسی چیزوں سے کوئی حکومت بہت دنوں تک صرفِ نظر نہیں کرسکتی، اس لیے خود برطانوی حکومت کو اس عوامی ضرورت کے اہتمام کے لیے بادلِ ناخواستہ سامنے آنا پڑا۔ برطانوی حکومت کے ساتھ خودمختار ریاستوں نے بھی اس سمت میں پیش قدمی کی۔ طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (1927ء)، مدرسہ طبیہ لکھنؤ (1927ء)، گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ (1926ء)، مدرسہ آصفیہ طبیہ بھوپال (1903ء)، گورنمنٹ نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد، یہ سارے ادارے حکومت اور ریاستوں کی سرپرستی میں وجود میں آئے تھے۔ چونکہ انہیں حکومت کا تعاون حاصل تھا اور یہ نسبتاً مضبوط بنیادوں پر استوار تھے، لہٰذا انہیں علمی اور عوامی حلقوں سے اعتبار ووقار حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی اور یہ بہت جلد موثر کردار میں آگئے اور اپنے حلقۂ اثر میں مرکزیت کے حامل بن گئے۔ شمال، جنوب اور وسطی ہندوستان میں اِن اداروں سے یونانی طب

کے تعلیمی نظام کو بڑی وسعت ملی۔ آج بھی اِن کا شمار یونانی طب کی معتبر درس گاہوں میں ہے۔

برطانوی عہد میں استاذی تعلیم کی جگہ درس گاہی نظام قائم کر کے ایک تو یونانی طب کے تعلیمی سلسلے کو منظم شکل دی گئی، دوسرے روایتی طرزِ تعلیم کی تجدید پر بھی اطباء کی خاص توجہ رہی۔ چنانچہ روایتی نصاب کی جگہ یونانی کے ساتھ ایلوپیتھی کے جدید مضامین پر مشتمل ایک مخلوط نصاب ترتیب دیا گیا۔ اسے مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور اُن کے ہم خیال اطباء نے وضع کیا تھا۔ تجدید طب کے نام پر اس کا چلن اُس زمانہ کی دوسری طبی درس گاہوں میں بھی ہوا۔ جدید مضامین کی تعداد میں کسی قدر افراط و تفریط کے ساتھ یہی نصاب موجودہ طبی درس گاہوں میں بھی پڑھا اور پڑھایا جارہا ہے۔

برطانوی عہد میں طبّی ترجمہ نگاری

ہندوستان میں نوآبادیاتی اثرات کے تحت زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح لسانی منظرنامے پر بھی بدلاؤ کے رجحان نظر آتے ہیں۔ اُس عہد میں عوامی رابطہ کی زبان کی صورت میں اردو کے فروغ کو ایک بڑی لسانی تبدیلی کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اردو جیسی نوزائیدہ زبان کو عوامی رابطہ کا متحمل بنانے کا مرحلہ، اُس کے اندر ادبی اور علمی اہلیت پیدا کیے بغیر عبور نہیں ہو سکتا تھا۔ فوری طور پر اردو زبان میں یہ توانائی صرف ترجمہ کے ذریعہ آ سکتی تھی، اِس مقصد کے لیے فورٹ ولیم کالج کلکتہ، جارج سینٹ جانسن کالج مدراس اور دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی جیسے ادارے وجود میں آئے۔ اردو کو عوامی حیثیت مل جانے کے بعد اسے علمی چلن میں لانے کے لیے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور کشمیر میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دارالترجمہ وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا۔

اِس نئے لسانی ماحول میں جب نو وارد صاحبان باقاعدہ اردو کی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے اور اہلِ ہنود رامائن اور بھگوت گیتا جیسی مذہب کی اساسی کتابیں اردو میں پڑھنے لگے، تو یونانی طب کا عربی اور فارسی پیراہن بدلنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ یہ خیال سب سے پہلے اہلِ مطابع کو آیا، اس سلسلے میں مطبع منشی نول کشور اوّلیت کا حامل ہے۔ اُس نے 1858ء میں اپنے قیام کے فوراً بعد ہی طبی کتابوں کے ترجمے اور اُن کی اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا۔ اِس مطبع میں طبی ترجمہ نگاری کا ایک مستقل شعبہ تھا۔ حکیم نور کریم دریابادی، حکیم سید غلام حسنین کنتوری، حکیم ہادی حسین خاں مرادآبادی، حکیم واجد علی موہانی، حکیم محمد ایوب اسرائیلی، حکیم سید عابد حسین وغیرہ مطبع منشی نول کشور کے

دارالترجمہ کے اہم اراکین میں تھے۔

مطبع کا عام مفہوم پریس یا چھاپہ خانہ ہوتا ہے، لیکن منشی نول کشور کے مطبع میں صرف طباعت اور چھپائی نہیں ہوتی تھی، بلکہ یہ اپنے دائرۂ عمل کی وسعت کے لحاظ سے ایک مکمل ریسرچ انسٹی ٹیوشن کا درجہ رکھتا تھا۔

عربی وفارسی زبان کے طبی سرمایہ کی اردو زبان میں منتقلی کے سلسلے میں مطبع منشی نول کشور کے دارالترجمہ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انیسویں صدی ہی میں یونانی طب کی امہات الکتب کامل الصناعہ، القانون فی الطب، قانونچہ، ذخیرۂ خوارزم شاہی، اکسیرالقلوب، مخزن الادویہ، کفایۂ منصوری، نفیسی، سدیدی، اقسرائی، شرحِ اسباب وعلامات، قرابادینِ ذکائی اور علاج الامراض جیسی کتابوں کے ترجمے یہاں سے اشاعت پذیر ہو چکے تھے۔

مطبع منشی نول کشور کے علاوہ اُس عہد کے دوسرے مطابع نے بھی طبی ترجموں کی اشاعت میں کردار ادا کیا ہے۔ مطبع مصطفائی میرٹھ، محبوب المطابع برقی پریس دہلی، مطبع مجتبائی دہلی، مطبع افتخار المطابع دہلی، مطبع جوالا پرکاش میرٹھ، مطبع مجمع العلوم لکھنؤ، مطبع منشی گلاب سنگھ لکھنؤ، مطبع نامی رائے بھوانی پرشاد، مطبع اسلامیہ لاہور وغیرہ اِس سلسلے کے مزید اہم نام ہیں۔ طبی کتابوں کو اردو میں منتقل کر کے اِن مطابع نے اردو زبان میں طب کے چلن کی راہ ہموار کرنے میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

مولوی آغا رفیق بلند شہری، حکیم احسان علی قادری، حکیم سید احمد حسین، حکیم محمد اسماعیل خاں ذبیح دہلوی، حکیم محمد اصغر علی، محمد اقبال بن حکیم مہتاب الدین لاہوری، حکیم مرزا امیر بیگ، حکیم محمد امین الدین خاں، حکیم سید محمد باقر سونی پتی، حکیم محمد بدر الدین خاں دہلوی، حکیم محمد بدر الدین کشمیری، خواجہ بدر السلام فروغی، پنڈت پیارے لال کشمیری، حکیم تاج محمد خاں افغان، حکیم محمد حامد علی خاں، حکیم حبیب اللہ، حکیم سید محمد حسن، حکیم محمد حسن حاذقؔ میرٹھی، حکیم محمد حسن علی، شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی، منشی حسیب الدین احمد سوزاںؔ، حکیم محمد حسین صدیقی نانوتوی، حکیم حسین الدین احمد جون پوری، شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں، حکیم دیوان کاہن چند کپور، حکیم رحیم بخش سہارن پوری، حکیم خواجہ محمد سلامت اللہ، حکیم محمد شمس الدین بھاول پوری، حکیم ظہیر احمد شاہ ظہیرؔی، حکیم سید عابد حسین لکھنوی

حکیم محمد عبد الحلیم لکھنوی، حکیم عبد العزیز محمد بٹالوی، حکیم مولوی محمد عبد العزیز کامل، حکیم محمد عبد الغنی رمضان پوری، حکیم قاضی محمد عبد اللطیف، حکیم محمد عبد الواحد، حکیم عبد الہادی، حکیم عظمت علی حسرت لکھنوی، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، حکیم غلام حیدر لاہوری، حکیم فدا محمد خان، حکیم فضل الرحمان، حکیم محمد فضل اللہ، حکیم منشی فضلِ حق تمکین، حکیم محمد فیروز الدین، حکیم کاظم علی، حکیم شیخ لیاقت حسین، حکیم مولوی مرزا محمد مہدی، حکیم ابوالکلام مختار احمد مختار، شفاء الملک حکیم سید مظاہر احمد، حکیم سید منور حسین لکھنوی، حکیم محمد منور علی خاں، حکیم ولی اللہ خاں، حکیم مولوی ھبۃ اللہ، حکیم سید محمد یوسف نیر وغیرہ کے اسماء برطانوی عہد میں طبی ترجمہ نگاری کے حوالہ سے بے حد قابلِ ذکر ہیں، اِن کی کوششوں سے اُس وقت کے لسانی تقاضے سے یونانی طب کو ہم آہنگ ہونے میں مدد ملی۔

اِن مترجمین کی کوششوں سے برطانوی عہد میں یونانی طب کے علمی سرمایہ کا قابلِ لحاظ حصہ اردو میں منتقل ہوگیا تھا، مگر طبی درس گاہوں میں اب بھی عربی و فارسی متون پڑھے اور پڑھائے جارہے تھے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے اسے طلبہ پر لسانی بوجھ قرار دیتے ہوئے اردو زبان میں طبی تعلیم کی تحریک شروع کی۔ اُن کی اِس تحریک کو کامیاب بنانے میں حکیم محمد کبیر الدین کے 'ادارۂ المسیح' اور حکیم خواجہ رضوان احمد کے 'دار التالیفات' کی مساعی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اِن دونوں اداروں سے درسی ضرورت سے تعلق رکھنے والی کئی اہم کتابوں کے ترجمے ہوئے اور متعدد کتابوں کی تالیف عمل میں آئی، جو آج تک درسی مقصد کے لیے استعمال ہورہی ہیں۔ ترجمہ وتالیف کے ذریعہ طبی درسیات کی تیاری میں حکیم محمد کبیر الدین اور حکیم خواجہ رضوان احمد کی خدمات اِس قدر اہم ہیں کہ اِن سے صرفِ نظر کرکے برطانوی عہد میں شروع ہونے والی ترجمہ نگاری، تصنیف وتالیف اور اردو زبان میں طبی تعلیم کی روایت کو سمجھا نہیں جاسکتا ہے۔

برطانوی عہد میں طبی ترجمہ نگاری کے عمل سے اردو زبان سے یونانی طب کے لسانی رشتہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اِس کا جہاں یہ پہلو قابلِ ذکر ہے کہ یونانی طب مانوس اور عوامی زبان میں آسکی، وہیں اِس کا فائدہ اردو زبان کو یہ ہوا کہ اس کے اندر علمی وفنی مصطلحات کی آمد سے وسعت وجامعیت پیدا ہوئی اور یہ زبان علمی مضامین کے طرزِ ادا سے بہرہ ور ہوئی، اس لیے کہ اس سے پہلے اردو کا

بیشتر استعمال ادبی اور مذہبی مضامین کی ترسیل کے لیے ہورہا تھا۔

برطانوی عہد میں اردو زبان میں طبی ترجمہ نگاری کے آغاز کے بعد، دھیرے دھیرے اردو زبان میں تصنیف وتالیف کی روایت نے بھی جنم لیا، اِس کام کے لیے اولاً انہیں تراجم سے اخذِ مواد کیا گیا تھا، لیکن اِن تراجم کی اہمیت کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ موجودہ عہد کے لیے ماضی سے زیادہ اہم ہیں، اس لیے کہ عہدِ حاضر میں یونانی طب کے کلاسیکی سرمایہ سے استفادے کا سارا انحصار انہیں ترجموں پر ہے۔

برطانوی عہد میں اردو زبان میں یونانی طب کی کتابوں کی منتقلی میں جس طرح مطابع نے خاص کردار ادا کیا ہے، اُسی طرح طبِ جدید کی کتابوں کے ترجمہ کے سلسلے میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے دارالترجمہ کی مساعی اہمیت رکھتی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں اردو زبان میں میڈیکل سائنس کی تعلیم کے لیے جدید طب کے تقریباً تمام ہی مضامین کی کتابوں کے ترجمے ہوئے تھے، ان ترجموں کے لیے وضع اصطلاحات کا جو کام ہوا تھا، اُس کا شمار اردو زبان کے گراں قدر مصطلحاتی اضافات میں ہے۔ طبِ جدید کے مترجمین میں ڈاکٹر خورشید حسین، ڈاکٹر محمد عثمان خاں، ڈاکٹر غلام دستگیر، ڈاکٹر ی، الف حسین کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔

حالانکہ جامعہ عثمانیہ نے یہ تراجم اپنے یہاں اردو زبان میں ماڈرن میڈیکل سائنس کی تعلیم کے لیے کروائے تھے، اس لیے کہ جامعہ کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ معاصر علوم کی اردو زبان میں تعلیم دی جائے، لیکن اِن تراجم سے یونانی طبیبوں کو بھی استفادے کا موقع ملا، اس لیے کہ طبِ جدید کے یہ مضامین یونانی طبی درس گاہوں میں بھی داخل نصاب تھے۔

برطانوی عہد میں انجام پانے والے طبی کتابوں کے اردو ترجمے ماضی سے زیادہ دورِ حاضر میں اہمیت رکھتے ہیں، اس لیے کہ موجودہ طبی دنیا کلیتاً انہیں تراجم پر انحصار کرتی ہے، لہٰذا اردو طبی ترجمہ نگاری کے سلسلے میں برطانوی عہد کی اِن مساعی سے خاطر خواہ واقفیت کے بغیر کماحقہٗ ان سے استفادہ ممکن نہیں ہے۔

آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کی حصولیابیاں

حکیم اجمل خاں کے کاموں میں جو تنوع ہے، اسے دیکھ کر گمان کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سارے کام تنہا ایک فرد کے ہیں۔ ہر میدان میں امتیاز پیدا کر لینا اور تمام شعبوں میں اعلیٰ مقام پر فائز ہو جانا یہ واقعی عقل کو حیران کر دینے والی بات ہے۔ حکیم اجمل خاں کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو بار ہا ایسے حیران کن تجربوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تعلیمی میدان میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ۔ سیاسی، ملی اور تحریکی میدان میں انڈین نیشنل کانگرس، مسلم لیگ، خلافت کانفرنس، جمعیۃ العلماء، تحریکِ ترکِ موالات وغیرہ حکیم اجمل خاں کے قائدانہ کردار کی اس قدر روشن مثالیں ہیں کہ نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

مذکورہ سطور میں مسیح الملک کے جن کاموں کا تذکرہ ہے، ان سے ان کی وابستگی بہت حد تک اس عہد کے مخصوص سیاسی اور ملکی حالات کا نتیجہ ہے، لیکن طب وہ میدان ہے، جس سے ان کا خاندانی رشتہ رہا ہے، اسی لیے یہ ان کے خمیر میں رچی بسی تھی اور یہی ان کی زندگی کا اصل میدانِ عمل ہے۔ اس میں بھی ان کی شخصیت کا ہفت پہلوی انداز صاف نظر آتا ہے۔ مدرسہ طبیہ دہلی سے لے کر آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرول باغ، مدرسہ طبیہ زنانہ، ہندوستانی دواخانہ، طبی ریسرچ، طبی نصاب تعلیم، تصنیف و تالیف وغیرہ میں انہوں نے جو انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، ان سے ان کی متنوع شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔

یونانی طب کے استحکام اور فروغ کے تعلق سے انہوں نے جو کام کیے ہیں، وہ سب

اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے قیام سے نہ صرف دیسی طبوں کے فروغ کی راہیں استوار ہوئیں، بلکہ اس کے ذریعہ انہیں ہندوستان میں اپنے وجود کو باقی رکھنے کا قانونی حق مل پایا۔

حالانکہ دیسی طبوں کے لیے عرصۂ حیات کا تنگ ہونا اسی وقت شروع ہو گیا تھا، جب ہندوستان پر غیر ملکی تسلط کا آغاز ہوا۔ مگر 1857ء کے سانحہ کے بعد جس طرح کے حالات سے مقامی طبوں کو گزرنا پڑا، وہ ناقابل تصور ہے۔ اب تک دیسی طبوں کو مٹانے کی تحریک خفیہ شکل میں یا پسِ پردہ تھی اور سارے حملے پیٹھ پیچھے سے ہو رہے تھے، لیکن 1910ء میں پیش آنے والے حالات کے بعد دیسی طبوں کی مخالفت میں، حکومت کھل کر سامنے آگئی اور مغربی طب کے علاوہ باقی ساری طبوں کو وحشی اور ان کے حاملین کو عطائی گردان کر، ہمیشہ کے لیے ان کے وجود کو ختم کرنے کی سازشیں شروع ہو گئیں۔

25 فروری 1910ء کو بمبئی میڈیکل ایسوسی ایشن نے ریاستی حکومت کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ قانونی معاملات میں صرف طبِ جدید کے لوگوں کی اسناد ہی قابلِ قبول ہوں اور دوسری طبوں کے حاملین کے عطا کردہ سرٹیفکٹ ناقابل اعتبار قرار دیے جائیں۔ یہ مطالبہ حکومت کے منشاء کے مطابق تھا، لہٰذا فوراً اسے قانونی شکل دینے کی تیاری کر لی۔ دراصل بمبئی میڈیکل ایسوسی ایشن کا یہی مطالبہ آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے متحرک ہونے کا باعث بنا۔ حالانکہ اس تنظیم کا قیام 1906ء میں ہو چکا تھا، مگر اس واقعہ سے پہلے اس کی کوئی قابلِ ذکر سرگرمی نہیں تھی۔ بمبئی میڈیکل ایسوسی ایشن کی صوبائی حکومت کو پیش کردہ تجویز کے بعد دہلی تک محدود تنظیم، قومی سطح کی تحریک بن گئی اور 26، 27 نومبر 1910ء کو اس کا پہلا قومی سطح کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔

بمبئی حکومت کو صوبائی میڈیکل ایسوسی ایشن کی ارسال کردہ تجویز کے بعد حکیم اجمل خاں نے دیسی طبوں کے حقوق کی بازیابی، ویدوں اور طبیبوں کی بیداری کے لیے جو تحریک شروع کی وہ ایسا کارنامہ ہے، جو ان کے تمام علمی، سیاسی اور طبی کاموں میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ دیسی طبوں کے حاملین کو اس ایکٹ کے مضمرات سے آگاہ کرنا اور اس کی نامنظوری کے لیے

حکومت پر دباؤ ڈالنا، اس تحریک کا اہم مقصد تھا، اس کے حصول کے لیے طبیبوں اور ویدوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے مشترکہ جدوجہد کی گئی۔ گو کہ یہ مسئلہ آیورویداور یونانی طب کا تھا، مگر حکیم اجمل خاں نے ویدوں اور طبیبوں کے ساتھ اس عہد کے تمام مسلم اور غیر مسلم دانشوروں اور ایوانِ حکومت میں موجود عوامی نمائندوں کو اس سے جوڑ کر قومی تحریک کی شکل عطا کر دی۔ مذہب وملت کی تفریق سے الگ ہو کر تمام ہندوستانیوں کا کسی مسئلہ میں متحد ہو جانا، اس عہد کے تناظر میں ایک بڑا واقعہ تھا۔

اس تحریک کا ایک خوشگوار پہلو یہ سامنے آیا کہ وید اور اطباء پہلی بار کسی مسئلہ میں متحد نظر آئے۔ چونکہ یہ دونوں طبیں یکساں تہذیبی پسِ منظر کی حامل تھیں اور ایک ہی ملک ان کا میدانِ عمل تھا، لہٰذا فنی رقابتوں کا پیدا ہو جانا ایک بدیہی امر تھا۔ ویدوں اور طبیبوں کے درمیان حائل دوریوں کو مٹانے میں مسیح الملک کی اس تحریک نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اسے کانفرنس کی ایک اہم حصولیابی سمجھا جانا چاہیے۔

آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے معرض وجود میں آنے کے بعد ویدوں اور طبیبوں میں فنی تحریک کی ضرورت کا احساس بیدار ہوا اور بڑی تعداد میں ان دونوں طبوں کے حاملین اس تحریک کا حصہ بنے۔ اس کے زیر اثر علاقائی اور ریاستی سطحوں پر دوسری کئی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ مثلاً پنجاب، ممبئی، مدراس اور صوبہ جات متحدہ کے اندر مقامی طور پر طبیبوں نے متحد ہو کر طب کے احیاء اور تحفظ کا کام شروع کیا۔ علاقائی اور ریاستی سطح پر طبیبوں کو منظم کرنے کے علاوہ وہاں کے عوامی نمائندوں کو اس تحریک سے جوڑ کر دیسی طبوں کے لیے زمین ہموار کرنے میں ان مقامی تنظیموں نے بڑا ہی کلیدی کردار ادا کیا۔ پنجاب اور مدراس میں مقامی تنظیموں کی کوششوں سے ان علاقوں میں طب کے تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا اور طب کے تعلیمی دائرہ کی توسیع ہوئی۔ ورنہ اس سے پہلے دہلی اور لکھنؤ کو طبی تعلیم کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ طب کے روایتی مراکز کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے خطوں میں بھی تعلیم کی ضرورت کے احساس اور اس کے لیے عملی کوششوں کے آغاز سے ایک نئے عہد کی شروعات ہوئی۔ مسیح الملک کی تحریک کے زیر اثر طبیبوں میں فن کے تئیں جو رجحان اس عہد میں سامنے آئے، اس سے طب کے روایتی انداز میں

بدلاؤ محسوس کیا گیا اور طبی منظر نامہ میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں سامنے آئیں۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں طبی کینوس پر تبدیلیوں کے جو اثرات نظر آتے ہیں ان میں طبی صحافت سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ حالانکہ اس کی شروعات تحریکی ضرورتوں سے ہوئی تھی اور مسیح الملک نے رام پور سے واپسی کے بعد اس کی اہمیت محسوس کر کے 'مجلہ طبیہ' کا آغاز کر دیا تھا۔ لیکن ملکی سطح پر طبی صحافت کا جو فروغ 1910ء کے بعد دیکھنے میں آیا وہ دراصل کانفرنس کے مساعی کا حصہ ہے۔ اس عہد کی طبی صحافت سے طبیبوں سے رابطہ کے علاوہ، ان کی ذہن سازی اور ان کے خفتہ شعور کی بیداری میں بڑی مدد ملی اور طبی صحافت کی وجہ سے فنی رابطہ کی ایک عمدہ شکل پیدا ہوئی۔

کانفرنس کے آغاز کے وقت اس کا سب سے بڑا مقصد میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ کو پاس ہونے سے روکنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کانفرنس کو سخت جدوجہد کرنی پڑی اور کد و کاوش کے ایک طویل دور سے گزرنا پڑا، مگر اس تحریک کی وجہ سے نہ صرف حکومت اس ایکٹ کی منظوری سے باز رہی، بلکہ ان طبوں کی فنی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں قانونی جواز کا سرٹیفیکٹ بھی عطا کیا۔

اس تحریک نے عوامی صحت کے لیے دیسی طبوں کی ناگزیریت کی ایسی وکالت کی کہ خود حکومت کو اس کے فروغ کے لیے اقدام پر مجبور ہونا پڑا۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم نافذ ہو جانے کے بعد دیسی طبوں کا صیغہ کونسل کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا۔ اب حکومت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ جمہوری مطالبات پر سرِ تسلیم خم کر دے۔ مدراس کمیٹی کی رپورٹ کے بعد طب کی مخالفت کی بحث عملاً ختم ہو گئی۔ اس کمیٹی نے طبِ قدیم کا امعان نظر سے مطالعہ کر کے اسے معقول اور سائنس کے مطابق قرار دیا۔ مدراس کمیٹی کی رپورٹ کے بعد حکومتِ مدراس نے طبی اسکول اور حکومتِ بہار نے ویدک اور یونانی اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ صوبہ جات متحدہ کی حکومت کی طرف سے بورڈ آف انڈین میڈیسن کا قیام عمل میں آیا۔ بورڈ کی تجویز پر بنارس اور ہری دوار میں ویدک کالج اور اسکول، علی گڑھ اور لکھنؤ میں طبیہ کالج اور طبی مدرسہ کے لیے خطیر رقم منظور کی گئی اور ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں میں طبیبوں اور ویدوں کی تقرری کی راہ ہموار ہوئی۔

مذکورہ سطور میں کانفرنس کی حصولیابیوں کا جس زاویہ سے مطالعہ کیا گیا ہے۔اس سے بہت سے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں، جو مقصود ہونے کے لحاظ سے ضمنی حیثیت کے حامل ہیں، مگر اثرات کے لحاظ سے بے حد اہم ہیں اور ان کے تناظر میں طبی کانفرنس کی حصولیابیوں کا دائرہ نہایت وسیع ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ تذکرہ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی، ناشر ناظم مشیر الاطباء وچشمہ زندگی، حویلی کابلی مل پریس، 1928ء

2۔ حکیم اجمل خاں، حکیم سید ظل الرحمٰن، نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا، 2004ء

3۔ تذکرہ مسیح الملک، حکیم محمد حسن قرشی، ناشر ناظم مشیر الاطباء وچشمہ زندگی، حویلی کابلی مل پریس۔ 1928ء

4۔ سیرت اجمل، حکیم جمیل خاں، شائع کردہ ہندوستانی دواخانہ، دہلی، غیر مورخ

شمس الاطباء حکیم و ڈاکٹر غلام جیلانی

غلام جیلانی 15 مئی 1873ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد حکیم سلطان محمود انصاری اپنے وقت کے جید عالم اور عالی مرتبت طبیب تھے۔ جیلانی کے اجداد ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔

غلام جیلانی نے نورمل اسکول لاہور سے مڈل پاس کیا۔ اُنہیں عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ طب کی تعلیم اپنے والد حکیم سلطان محمود انصاری اور بعض دوسرے اطباء سے حاصل کی۔ لاہور میڈیکل کالج میں داخل ہو کر ڈاکٹری پڑھی۔ اس وقت ہندوستان میں جدید طب کی تعلیم صرف ڈپلومہ تک محدود تھی۔ غلام جیلانی نے 1895ء میں ایل ایم ایس کا ڈپلومہ کیا اور اسی سال سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ چند سال میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے خدمت انجام دینے کے بعد ایران میں طبّی خدمات کے لیے ان کا تقرر ہوا۔

حکیم فیروز الدین لکھتے ہیں کہ ابتداء میں وہ گورنمنٹ برطانیہ کے قونصول یعنی سفیر متعینہ قاینات و کرمان کے ڈاکٹر مقرر ہوئے، لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد دارالحکومت قاینات (ایران) میں برٹش ایجنٹ مقرر کیے گئے اور طبّی مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، پھر گورنمنٹ برطانیہ کے سفارت خانہ سیستان کے میڈیکل آفیسر مقرر ہوئے۔ ان ملازمتوں کے دوران غلام جیلانی نے بڑی عزت و شہرت حاصل کی۔

انگلستان کے ایک نامور سیاح سیوج ہنری لینڈور نے اپنے سیاحت نامۂ ایران و ترکستان موسوم بہ 'ایکراس کیوٹے ٹڈ لینڈ' میں جیلانی کی تصویر شائع کر کے سیستان میں ان کی خاص قدر و منزلت کا ذکر کیا ہے اور ان کی طبّی قابلیت کی تعریف کی ہے۔ ملازمت کے دوران ایران و سیستان کے امراء

اور برطانوی حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں کے علاج ومعالجہ کا جیلانی کو موقع ملا اوران کی جانب سے جیلانی کو طبی قابلیت کے لیے توصیف نامے عطا ہوئے۔

ایران میں اعلیٰ طبی خدمات کے صلہ میں شمس الاطباء کے معزز خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ 1903ء میں مظفرالدین شاہ مرحوم، شاہ ایران نے 'شیر وخورشید' کا ممتاز تمغہ مرحمت فرمایا، 1904ء میں ایران کی شاہی مجلسِ حفظِ صحت نے انہیں اپنا رکن منتخب فرمایا۔ اسی سال گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے 'خان صاحب' کا خطاب عطا ہوا۔

1907ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوکر لاہور میں ذاتی مطب شروع کیا، لیکن ان کا زیادہ وقت تصنیف وتالیف میں صَرف ہوتا تھا۔

غلام جیلانی کو قدیم وجدید دونوں طبوں میں مہارت حاصل تھی۔ اس زمانہ میں ایسی صلاحیتوں کی حامل کوئی اور شخصیت نہیں تھی۔ وہ بیک وقت حکیم وڈاکٹر دونوں تھے۔ وہ فنی صلاحیتوں سے مالا مال تھے اور تصنیف وتالیف کے بادشاہ تھے۔ ان کی تصنیفات طبی دنیا میں بے حد مقبول ہوئیں۔ ان کی ایک کتاب 'مخزن الحکمت'، جس کا دوسرا نام 'گھر کا حکیم وڈاکٹر' ہے، اس کے چودہ پندرہ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اس زمانہ میں اکثر پڑھے لکھے گھروں میں یہ کتاب موجود ہوتی تھی۔ کتنے ہی ایسے لوگ تھے جو صرف 'مخزن الحکمت' پڑھ کر حکیم اور ڈاکٹر بن گئے۔

حکیم غلام جیلانی نے ادویہ، معالجات، تاریخ اور لغت کے موضوع پر جو کتابیں تالیف کی ہیں، ان سے آج بھی استفادہ کیا جارہا ہے۔ تالیف کے زمانہ میں یہ کتابیں اتنی مقبول تھیں کہ ان کی ایک ایک جلد از راہِ قدر دانی انڈیا آفس لندن اور برٹش میوزیم لندن کے سرکاری کتب خانوں میں رکھی گئی تھی۔

غلام جیلانی کی تصنیفات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1۔ مخزن الادویہ ڈاکٹری (مٹیریا میڈیکا باتصویر)

یہ کتاب علم طب میں ایک مفید اضافہ ہے۔ اس کے نسخے لندن اور برٹش میوزیم کے شاہی کتب خانوں، نیز امپیریل لائبریری کلکتہ اور میڈیکل کالج لاہور کی لائبریری میں رکھے گئے تھے، یہ بڑے افتخار کی بات تھی اس لیے کہ ان کتب خانوں میں نہایت منتخب

اور ممتاز کتابیں ہی رکھی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں میڈیکل کالج لاہور میں اردو کی صرف یہی ایک کتاب رکھی گئی تھی۔ یہ کتاب پہلی بار طبی کتب خانہ شمس الاطباء لاہور سے 1912ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں فنِ دواسازی، افعالِ ادویہ اور علم العلاج کے علاوہ ادویہ کی تاریخ و تحقیق اور ان کے ڈاکٹری و طبی اور ویدک ناموں کی تطبیق کی گئی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے، اس کی مجموعی ضخامت تقریباً 22 سو صفحات ہے، اس کتاب میں شامل ضمیمہ 'علاج الامراض' میں امراض کو ترتیب وار لکھ کر ہر مرض کے ساتھ یہ تحریر کیا گیا ہے کہ اس میں کون کون سی دوائیں اور نسخے مفید ہیں۔

اس کتاب کے ساتھ فہرستِ مضامین بھی شامل ہے، اس میں کتاب میں مذکور تمام مفرد و مرکب دواؤں کے ڈاکٹری، طبی، ویدک اور ہندوستانی ناموں کو حروف تہجی کی ترتیب پر لکھا گیا ہے۔ تاکہ کسی دوا یا مرض کے مجرب نسخہ کو معلوم کرنے میں آسانی ہو۔ اس زمانہ کے ڈاکٹروں اور طبیبوں نے اس کتاب کو بے حد سراہا تھا اور بہت سے اہلِ علم نے اسے طبیہ کالجوں کے نصاب میں شامل کرنے کی سفارش کی تھی۔

2۔ مخزن حکمت (گھر کا ڈاکٹر و حکیم)

خانگی طب یعنی فیملی میڈیسن کے موضوع پر ایک جامع تالیف ہے۔ اس میں عام فہم اردو زبان میں ڈاکٹری اصطلاحات اور اس کے طبی مترادفات کے ذریعہ نفسِ مضمون پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر مرض کا ڈاکٹری اور یونانی علاج پہلو بہ پہلو بیان کیا گیا ہے۔

صوبۂ پنجاب کی درسی کتب کی سرکاری کمیٹی نے اس کو اردو طبی لٹریچر میں ایک مفید اضافہ تسلیم کر کے اس کی قدر دانی کی سفارش کی اور گورنر بہادر کی طرف سے دو سو روپیہ انعام مرحمت ہوا۔ یہ کتاب انڈیا آفس لندن اور عجائب خانہ لندن کے سرکاری کتب خانوں میں رکھی گئی تھی۔

مخزن حکمت مندرجہ ذیل تین حصوں پر مشتمل ہے۔

حصۂ اول میں تشریح (باتصویر) حفظانِ صحت اور تیمارداری کو تین علاحدہ ابواب میں بیان کیا گیا ہے۔

حصہ دوم میں حمیات، امراضِ عامہ اور امراضِ متعدی کے علاوہ پندرہ ابواب میں سر سے پاؤں تک کی بیماریوں کا تذکرہ ہے۔

حصہ سوم میں مردوں، عورتوں (خصوصاً حاملہ وزچہ) نوزائیدہ بچوں کی خاص بیماریوں کے علاوہ ایکسیڈنٹ، ایمرجنسی اور دوسرے ناگہانی حالات مثلاً پوائزننگ وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔

ہر مرض کے شروع میں پہلے اس کے ڈاکٹری، طبی اور اردو نام بطور سرخی لکھے ہیں، پھر اس مرض کے اسباب وعلامات اور تشخیص وعلاج کو طبِ جدید اور طبِ قدیم کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

3۔ ہندوستان کی جڑی بوٹیاں

اس کتاب میں ان تمام جڑی بوٹیوں کا جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں، نیز ممالکِ غیر کی ان تمام نباتی ادویہ کا جو ہندستان میں پائی جاتی ہیں، مفصل بیان ہے۔

اس کتاب میں نباتی ادویہ کے ڈاکٹری، طبی، ویدک اور ہندوستانی نام، بعض ناموں کی وجہ تسمیہ، مقامِ پیدائش، مختلف اقسام، نباتی صفات، کیمیاوی اجزاء اور جوہر فعال، طریقۂ استعمال، افعال وخواص اور اس کے مرکبات ومجربات کا مفصل بیان ہے۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں ادویہ کے متعلق یونانی اور ہندی کی قدیم تحقیقات وتجربات کے ساتھ، جدید طبی تحقیقات اور تجربات کو پہلو بہ پہلو بیان کیا گیا ہے۔

تاریخ الاطباء (اشاعت 1913ء) میں مذکورہ کتاب کا ایک اشتہار شامل ہے، جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ علم الادویہ کی یہ کتاب 1914ء میں شائع ہوگی۔

4۔ تاریخ الاطباء

یہ تاریخ طب پر ایک جامع تالیف ہے۔ اردو زبان میں اپنے طرز کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں حکیموں، ڈاکٹروں اور ویدوں کی زندگی کے حالات، ان کی طبی خدمات اور تجربات واکتشافات کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1913ء میں نول کشور لمیٹڈ پریس لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اس پر بھی حکومت پنجاب کی طرف سے انعام عطا ہوا تھا۔

5۔ علاج بالمفرد یونانی وڈاکٹری

یہ کتاب 550 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سر سے لے کر پاؤں تک کے امراض کی ماہیت، اسباب وعلامات، طریق تشخیص اور اس سے متعلق یونانی وڈاکٹری مفرد ادویہ مع ترکیبِ استعمال درج کی گئی ہیں اور خاص مقامات پر امراض متشابہ کی تفریق وتمیز کے نوٹ دیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف میں تذکرۂ امام سویدی، رموزِ اعظم، اکسیر اعظم اور مفردات کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

6۔ قاموس طبی

یہ عربی، فارسی، یونانی اور انگریزی طبی مصطلحات کی ایک جامع کتاب ہے۔

حکیم غلام جیلانی اپنے عہد کی ایک سربرآوردہ علمی شخصیت تھے۔ وہ مختلف علمی کمیٹیوں کے ممبر تھے، طبی درس گاہوں میں ممتحن کے طور پر مدعو کیے جاتے تھے۔ ہندوستان میں طب کے تعلق سے حکیم جیلانی کا یہ نظریہ تھا کہ یہاں ہندو، مسلمان اور انگریز آباد ہیں اور یہاں ہندی، اسلامی اور انگریزی طبیں رائج ہیں، اس لیے یہاں طبی اتحادِ ثلاثہ کی ضرورت ہے، لہٰذا خذ ماصفا ودع ماکدر پر عمل کر کے ان طبوں کو باہم ملا کر ایک نیا نظام بنایا جائے۔ انہوں نے اس خیال کا اظہار تاریخ الاطباء میں کیا ہے۔ ان کی تمام تالیفات ان کے اس نظریہ کی مظہر ہیں۔

1926ء میں حکیم غلام جیلانی نے وفات پائی۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ رموز الاطباء، حکیم فیروز الدین، دار الکتب رفیق الاطباء، لاہور، طبع چہارم 1928ء

2۔ تاریخ الاطباء، ڈاکٹر حکیم غلام جیلانی، نول کشور اسٹیم پریس، لاہور، 1913ء

3۔ ہندوستان کے مشہور اطباء، حکیم سید حافظ حبیب الرحمان، ترقی اردو بیورو، دہلی، 2000ء

شفاء الملک حکیم عبدالرشید

شفاء الملک حکیم عبد الرشید، شیخ الہند حکیم عبدالعزیز کے بڑے صاحبزادہ ہیں۔ 11 شوال 1297ھ مطابق 16 ستمبر 1880ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اپنے والد کے تلامذہ خصوصاً حکیم عبدالوہاب آروی سے مروجہ درسیات پڑھیں۔ ان سے فراغت کے بعد اپنے والد اور خاندان کے بزرگوں سے طب کی تعلیم حاصل کی۔

یونانی طب کی مروجہ تعلیم میں تشریح اور جراحت کی کمی کا احساس، حکیم عبدالعزیز کو بہت شدت سے تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یونانی اطباء تشخیص و تجویز کے ساتھ فن جراحت سے بھی واقف ہوں۔ اُنہوں نے اس کا سامان خود اپنے گھر سے کیا۔ اس کا بندوبست یہ کیا کہ لکھنؤ کے سول سرجن ڈاکٹر کرنل اینڈرسن جو حکیم عبدالعزیز کے بہت مخلص دوست تھے، ان کی نگرانی میں تشریح اور جراحت سیکھنے کے لیے اپنے بیٹوں حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالحمید کو بھیج دیا۔ اینڈرسن نے ان دونوں بھائیوں کو تشریح اور سرجری کی باقاعدہ تعلیم دی، جب اینڈرسن کا تبادلہ لکھنؤ سے آگرہ ہوگیا تو یہ دونوں بھائی اُن کے ہمراہ آگرہ گئے اور وہاں دو سال رہ کر سرجری میں مہارت حاصل کی اور 1902ء میں سرجری کی تعلیم مکمل کر کے لکھنؤ آئے۔ یہاں حکیم عبدالرشید نے مطب شروع کیا۔ اس کے ساتھ تکمیل الطب کے کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ تکمیل الطب میں تدریس کے ساتھ وہ بحیثیت پرنسپل اس کے انتظامی امور کے نگراں رہے۔ 1911ء میں حکیم عبدالعزیز کے انتقال کے بعد وہ ان کی جگہ مسند نشین ہوئے۔

1911ء میں جب تکمیل الطب کی منتظمہ کمیٹی قائم ہوئی تو وہ اس کے آنریری سکریٹری مقرر ہوئے۔ ان کے زمانہ میں کالج نے خاطر خواہ ترقی کی اور 1917ء میں اس کا رجسٹریشن ہوا۔ حکیم عبدالرشید نے تکمیل الطب میں تعلیم و تدریس اور طلبہ کی عملی مشق کو منظم اور مربوط کرنے کے

سلسلہ میں جو مساعی انجام دی ہیں، اس سے کالج اور شفاخانہ کے نظام کو بڑا فروغ ملا۔

حکیم عبدالرشید نے اپنے عہدِ اہتمام میں تمام معاملات میں، خواہ وہ تعلیمی ہوں یا انتظامی، باقاعدہ ایک نظام قائم کیا اور سابقہ نصاب میں ضروری ترمیم کر کے ایک جامع سیلبس تیار کیا اور تکمیل الطب کو ایک معیاری درس گاہ بنانے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔

اپنے دورِ اہتمام میں اُنہوں نے ایک اہم کام یہ کیا کہ انڈور مریضوں کے لیے عمدہ اور اطمینان بخش دواؤں کی فراہمی کو یقینی بنایا اور کالج ہی میں مرکب دواؤں کی تیاری کا بندوبست کیا۔ اس کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ طلبہ کو دواسازی کی عملی مشق اور مفرد ادویہ کی شناخت کا موقع فراہم ہو۔

حکیم عبدالرشید کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے سرجری میں استعمال ہونے والی دواؤں کی جگہ یونانی ادویہ رائج کرنے کی کوشش کی اور ان کی مساعی سے بہت سی یونانی دوائیں شعبۂ سرجری میں رائج ہوئیں۔ آج ہندوستان کے کئی طبی کالجوں میں سرجری کی پی جی تعلیم ہو رہی ہے۔ یہاں اس قسم کی دواؤں پر تجربہ بڑا اہم تحقیقی کام ہوگا۔

تکمیل الطب کی تدریسی اور انتظامی مصروفیات کے علاوہ حکیم عبدالرشید کا ذاتی مطب بھی تھا۔ وہ علاج و معالجہ میں یکتائے روزگار تھے۔ عوام و خواص میں انہیں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ لکھنؤ اور اودھ کے رؤساء اور تعلقہ داروں کے علاوہ دوسری ریاستوں میں بھی علاج و معالجہ کے لیے مدعو کیے جاتے تھے۔ اُنہیں امراضِ صدر کی تشخیص میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ قارورہ اور سینہ کے معائنہ کے ذریعہ سل و دق کی تشخیص کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سعال مزمن کے ایک مریض کو جس کے بارے میں ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ اسے دق ہے، حکیم صاحب نے ان کے خیال کے برعکس مرض تشخیص کیا اور اس کے لیے دوائیں تجویز کیں، جس سے مریض کو افاقہ ہوا۔

اہلِ ثروت کی طرح غریب اور کمزور طبقہ کے مریضوں میں بھی حکیم عبدالرشید کو مقبولیت حاصل تھی۔ ان کے نسخے آسان، سستے اور مختصر ہوتے تھے۔ اکثر غریبوں کو آس پاس کھیتوں اور باغوں میں اُگنے والی جڑی بوٹیوں کی نشاندہی کر دیتے، جس سے مریضوں کو فائدہ ہو جاتا۔

مطب و معالجہ اور تکمیل الطب کی انتظامی مصروفیتوں کے ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی حکیم عبدالرشید شغل رکھتے تھے۔

1۔ الماعون فی الطاعون:

یہ حکیم اجمل خاں کے رسالہ 'الطاعون' کے مقابلہ میں لکھا گیا تھا۔ یہ 1897ء میں مطبع انوار محمدی، لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ 52 صفحات پر مشتمل ہے۔ طاعون اور دیگر وبائی امراض کے سلسلہ میں طبی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے یہ ایک مفید تالیف ہے۔

2۔ الہدیۃ الرشیدیہ فی اصول الصرفیہ:

یہ فارسی زبان میں ایک غیر طبی تالیف ہے، جسے حکیم عبدالرشید نے طالب علمی کے زمانہ میں تالیف کیا تھا۔ یہ بھی مطبع انوار محمدی، لکھنؤ سے طبع ہوئی ہے۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ امراضِ عین وعلاماتِ فارقہ فی الامراض المتشابہ بھی ان کی تالیفی کاوشوں میں شمار ہوتی ہیں۔ حکیم عبدالرشید اپنی اعلیٰ طبی اور فنی خدمات کے اعتراف میں 'خان' کے خطاب سے نوازے گئے اور برطانوی حکومت کی طرف سے شفاء الملک کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔

20 اپریل 1920ء کو اپنے والد کے انتقال کے محض نو سال کے بعد صرف 38 سال کی عمر میں وفات پائی اور خاندانی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

حکیم عبدالرشید نے حکیم عبدالعزیز کے مشن کو آگے بڑھانے اور تکمیل الطب کو ایک معیاری درس گاہ کا درجہ عطا کرنے میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، وہ ان کا ایک لازوال کارنامہ ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ تذکرۂ خاندانِ عزیزی، حکیم سید ظل الرحمن، ابن سینا اکاڈمی، علی گڑھ، اشاعت ثانی 2009ء

2۔ جہانِ طب (تکمیل الطب کالج نمبر)، جلد 4، شمارہ 2-1، جولائی۔ دسمبر 2002ء

3۔ الماعون فی الطاعون، حکیم عبدالرشید، مطبع انوار محمدی، لکھنؤ، 1315 ہجری

حکیم محمد الیاس خاں

طبّی تعلیم اور تحریک کے حوالہ سے برطانوی عہد کی تاریخ میں حکیم محمد الیاس خاں کی شخصیت نہایت اہم ہے۔

حکیم محمد الیاس خاں 1880ء میں اُتر پردیش کے ضلع ایٹہ کے قصبہ سہاور میں پیدا ہوئے۔اُن کی صغرسنی ہی میں اُن کے والد چودھری محمد امجد علی خاں کا انتقال ہوگیا۔والدہ نے تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔

وہ مشرقی علوم کی تحصیل کے لیے مدرسہ امینیہ، دہلی میں داخل ہوئے اور درس نظامی کی تکمیل کی۔اس سے فراغت کے بعد مدرسہ طبّیہ، دہلی سے طبّی علوم کی تحصیل کی اور یہاں سے 1901ء میں فارغ ہوئے۔اس مدرسہ میں انہیں حکیم عبدالمجید سے استفادہ کا موقع ملا۔

حکیم محمد الیاس خاں مدرسہ طبّیہ سے سند حاصل کر کے اپنے آبائی وطن قصبہ سہاور چلے گئے اور مطب کا آغاز کیا۔1901ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سرضیاء الدین یونیورسٹی کے چندہ کے سلسلہ میں سہاور گئے۔وہاں حکیم محمد الیاس خاں سے مل کر بے حد متاثر ہوئے اور انہیں علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔1902ء میں حکیم الیاس خاں علی گڑھ آئے اور اوپر کورٹ میں مطب شروع کیا۔

حکیم الیاس خاں علی گڑھ کے معاصر طبیبوں میں بہت کم عمر تھے۔اس کی وجہ سے انہیں اکثر لوگ ’بچہ حکیم‘ کے نام سے پکارتے تھے۔کم عمری کے باوجود حکیم الیاس خاں دستِ شفا کے مالک تھے اور مطب ومعالجہ کا نہایت پختہ شعور رکھتے تھے۔1920ء کے اوائل تک وہ علی گڑھ میں مقیم رہے۔

1909ء میں وقار الملک کے زمانہ میں یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کی طبی ضرورتوں کے لیے ایک یونانی شفاخانہ کا قیام عمل میں آیا۔اس میں حکیم الیاس خاں کا میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ یہاں اپنے فرائض انجام دینے کے ساتھ وہ ذاتی مطب سے بھی جڑے رہے۔

ادھر دہلی میں مدرسہ طبیہ کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔اس نے مدرسہ سے کالج کا درجہ حاصل کرلیا تھا اور اب اسے قرول باغ کے نو تعمیر وسیع وعریض کیمپس میں منتقل کرنے کی تیاری ہورہی تھی۔کالج کی نئی ضرورتوں کے پیش نظر مزید اسٹاف کی ضرورت تھی۔حکیم اجمل خاں کی دعوت پر 1920ء میں مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے سبک دوش ہوکر وہ دہلی منتقل ہو گئے اور طبیہ کالج سے ہاؤس فزیشین کی حیثیت سے وابستہ ہوئے۔

فنی جذبہ کے تحت حکیم الیاس خاں دہلی ضرور منتقل ہوئے،مگر اس کی وجہ سے انہیں بڑا نقصان اُٹھانا پڑا،لیکن فن کی خدمت کے لیے اس کو برداشت کیا۔گو کہ ابتداءً ان کا تقرر ہاؤس فزیشین کے لیے ہوا تھا،مگر بتدریج ترقی کر کے وہ سپرنٹنڈنٹ اور معالجات کے پروفیسر بنے۔

2 جولائی 1926ء کو حکیم اجمل خاں نے مجلسِ تحقیقاتِ علمی کے اراکین سے جو عہد لیا تھا،اس عہد نامہ پر دستخط کرنے والوں میں حکیم الیاس خاں بھی تھے۔یہ شعبہ دراصل آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرولباغ کا ایک توسیعی حصہ تھا۔ جب حکیم اجمل خاں نے مختلف شعبوں کی نگرانی اور ان کے انتظام کے لیے سب کمیٹیاں قائم کیں تو ایک 'ریسرچ سب کمیٹی' بھی قائم ہوئی تھی۔اجمل خاں اس کے چیرمین اور حکیم الیاس خاں ممبر سکریٹری تھے۔اس کے قیام کا اہم مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی طبی درس گاہوں کے لیے ایک ایسا نصاب مرتب کیا جائے،جو جامع ہو اور تحقیق پر مبنی ہو اور اس کے مسائل متفق علیہ ہوں تا کہ اسے ایک طبی مسلمہ کے طور پر طالب علم پڑھ کر مستفید ہوسکے۔

اس شعبہ کی پہلی پیش کش 'قانون عصری، حصہ اول' ہے،جسے حکیم محمد الیاس خاں نے مجلسِ تحقیقاتِ علمی کے ناظم کی حیثیت سے 1931ء میں پیش کیا تھا۔یہ کتاب طبی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے ذریعہ یونانی طب کے نظریاتی مسائل پر غور وفکر کے ایک

نئے عہد کا آغاز ہوا۔ مسیح الملک نے طبّی مسائل کو جدید اسلوب میں پیش کرنے لیے جو تحریک شروع کی تھی اور جس کے لیے وہ تا عمر کوشاں رہے، 'قانون عصری حصہ اول' ان کوششوں کا پہلا عملی اظہار ہے۔

اس کتاب کا سب سے اہم اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں یونانی طب کے فلسفیانہ نظریات کو جدید سائنسی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصلاح کے اس عمل میں بہت سے مسائل اور نظریات کے سلسلہ میں قدیم نظریات سے اختلاف کیا گیا ہے اور انہیں تبدیل کر کے سائنس کے موجودہ مسلمات و تجارب کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ان امور کی وضاحت خود حکیم الیاس خاں نے کتاب کے مقدمہ میں کی ہے۔

اس کتاب کے طرزِ تالیف اور جدید سائنس سے استفادہ کے طریقوں سے اختلافِ رائے کی گنجائش بہر کیف ہے، لیکن قدیم طبّی نظریات پر غور و فکر کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب کے ذریعہ طبّی مسائل کی تجدید و تنقیح کی طرف، اطباء کی توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یونانی طب کی تجدید کے حوالہ سے 'قانون عصری'، مسیح الملک کے فکری رجحانات کی دستاویز اور حکیم الیاس خاں کا ایک یادگار تالیفی کارنامہ ہے۔

حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حکیم محمد جمیل خاں، مجلس منتظمہ کے سکریٹری منتخب ہوئے، مگر شروع ہی سے خاندان کے دوسرے ارکان سے، اقتدار کے لیے ان کی رسہ کشی رہی۔ اس خاندانی نزاع کے اثرات کالج اور اس سے ملحق شعبوں پر پڑنے لگے۔ 1932ء میں کالج میں اسٹرائک ہوئی۔ طلبہ کی حمایت کے الزام میں حکیم محمد الیاس خاں، حکیم محمد کبیر الدین اور حکیم فضل الرحمان کو معزول کر دیا گیا۔ حکیم محمد الیاس خاں کی قیادت میں ان حضرات نے 1935ء میں قرول باغ کے نزدیک شیدی پورہ کے چوراہے پر 'جامعہ طبیہ' کے نام سے ایک نئی درس گاہ کی بنیاد ڈالی۔ اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بدولت اس نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔

اسی زمانہ میں نظام حیدرآباد کی تحریک پر نظامیہ طبّی کالج کا آغاز ہوا۔ ناظمِ طبابت حکیم مقصود یار جنگ نے 'جامعہ طبیہ' کے اساتذہ کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ اس دعوت پر حکیم محمد کبیر الدین اور حکیم فضل الرحمان حیدرآباد چلے گئے۔ حیدرآباد آنے کے لیے حکیم محمد الیاس خاں سے بھی اصرار

ہوا، لیکن انہوں نے اس دعوت کو مسترد کر دیا اور دہلی میں مقیم رہ کر' جامعہ طبیہ' کے استحکام کی تدبیریں کرتے رہے۔

1947ء میں تقسیم کے وقت قرولباغ میں بلوائیوں نے جم کر ہنگامہ کیا اور دونوں طبی کالجوں اور ادارۂ المسیح کو شدید نقصان پہنچایا۔

جامعہ طبیہ اور آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج کی بازآبادکاری کے لیے حکیم محمد جمیل خاں اور حکیم الیاس خاں نے ازسرِنو کوششیں شروع کیں۔ ابھی قرولباغ کے حالات سازگار نہیں ہوئے تھے، لہٰذا تعلیمی سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے جامعہ طبیہ اور طبیہ کالج کی مشترکہ تعلیم کے لیے گلی قاسم جان میں انتظام کیا گیا۔ حکیم الیاس خاں اس متحدہ کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ یہ کالج اسی تاریخی عمارت میں شروع ہوا، جس میں حکیم عبدالمجید خاں نے 'مدرسہ طبیہ' قائم کیا تھا۔

1949ء میں حالات سازگار ہونے کے بعد طبیہ کالج قرولباغ منتقل ہو گیا۔ مگر حکیم الیاس خاں نے جامعہ طبیہ کو گلی قاسم جان ہی میں جاری رکھا۔ 1949ء کے بعد یہ کالج انتظامی و مالی مسائل سے دوچار نظر آتا ہے۔ اس نازک گھڑی میں حکیم عبدالحمید بانی جامعہ ہمدرد، نئی دہلی نے اس کی دستگیری کی اور سہارا دیا۔ اُن کے تعاون سے حکیم الیاس خاں نے اس ادارے کو جاری رکھا اور آخر وقت تک اس کو اپنا سرمایۂ حیات قرار دے کر خدمت کرتے رہے۔

حکیم الیاس خاں تاعمر اس کی بقا اور فروغ کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ مگر انہیں خدشہ تھا کہ شاید ان کے بعد یہ باقی نہ رہے، لہٰذا انہیں اس کے لیے مضبوط ہاتھوں کی تلاش تھی، چونکہ حکیم عبدالحمید 1949ء ہی سے مالی تعاون دے رہے تھے، لہٰذا وہ اسے سنبھالنے کے لیے سب سے زیادہ مناسب تھے۔

حکیم الیاس خاں نے اپنے انتقال سے پہلے یہ وصیت فرمائی تھی کہ اُن کے بعد یہ ادارہ حکیم عبدالحمید کی تولیت میں دے دیا جائے۔ حسبِ وصیت 1963ء میں یہ طبی درس گاہ حکیم عبدالحمید کی تولیت میں دے دی گئی۔ انہوں نے اسے تحویل میں لے کر تغلق آباد میں واقع جامعہ ہمدرد کے کیمپس میں منتقل کر دیا اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن اس کے اخراجات کی کفیل بن گئی۔ یہاں پہنچ کر اب یہ 'جامعہ طبیہ' کے بجائے 'ہمدرد طبیہ کالج' کے نام سے موسوم ہوا۔

حکیم محمد الیاس خاں محض طب کے استاد اور ایک طبی ادارہ کے بانی ہی نہیں، بلکہ اپنے عہد کی ایک نمائندہ شخصیت تھے۔انہوں نے نمائندگی کے اس فریضہ کو بخوبی انجام دیا ہے۔

حکومتِ ہند نے 1948ء میں دیسی طبوں کی ترقی اور نصابِ تعلیم پر غور کے لیے 'پنڈت کمیٹی' کی تشکیل کی تو الیاس خاں اس کے ممبر مقرر ہوئے۔اس کمیٹی نے 1952ء میں اپنی سفارشات پیش کیں۔

1955ء میں دیسی طبوں کے نصاب اور تحقیق کے سلسلہ میں ایک ریسرچ کمیٹی قائم ہوئی۔اسی طرح مرکزی حکومت کی طرف سے چوپڑا کمیٹی، پنڈت کمیٹی اور دوے کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔حکیم الیاس خاں ان تمام کمیٹیوں کے ممبر رہے اور ان میں یونانی طب کی نمائندگی کی۔

1954ء میں دیسی طبوں کے احیاء اور فروغ کے لیے بورڈ آف آیورویدک اینڈ یونانی سسٹم آف میڈیسن قائم ہوا تو حکیم محمد الیاس خاں یونانی طب کے نمائندہ کی حیثیت سے اس بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے۔

حکیم الیاس خاں، مسیح الملک کی تحریک کے علمبرداروں میں تھے۔مسیح الملک نے تعلیم و تحقیق سے متعلق جس مشن کا آغاز کیا تھا، الیاس خاں اس کے ایک اہم رکن تھے۔اُنہوں نے مسیح الملک کی تحریک کو ہمیشہ حرزِ جاں بنائے رکھا۔اجمل خاں کے انتقال کے بعد آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس جب قیادت کے مسئلہ سے دوچار ہوئی، اس زمانہ میں حکیم محمد الیاس خاں سامنے آئے اور حکیم غلام کبریا خاں کے ساتھ مل کر اسے تقویت عطا کی۔ویدمان سنگھ کے انتقال کے بعد وہ کانفرنس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے اور ان کی مساعی سے کانفرنس کے بڑے کامیاب اجلاس منعقد ہوئے۔

ملک کی تقسیم کے بعد کانفرنس کا شیرازہ منتشر ہوگیا، حکیم الیاس خاں اور حکیم عبدالحمید وغیرہ کی کوششوں سے اطباء کی شیرازہ بندی کے لیے آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے نام سے یہ تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔حکیم الیاس خاں نے اس کے احیاء میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

23 فروری 1963ء کو دورۂ قلب کا شدید حملہ ہوا، 26 فروری کو 82 برس کی عمر میں وفات پائی۔27 فروری کو حسبِ وصیت قبرستان مہندیان میں دفن ہوئے۔

ان کے انتقال پر حکیم عبدالحمید دہلوی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

''وہ میرے شفیق رہنما اور خیر خواہ تھے، طبی مسائل کے حل میں ان کی شخصیت جو کام کر جاتی تھی، وہ ہماری بہت سی تدبیریں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ گلی قاسم جان کے ایک کونے میں بیٹھ کر وہ ملک کی تمام طبی سیاست پر نظر رکھتے تھے''۔

حکیم الیاس خاں کے سانحۂ ارتحال پر حکیم محمد کبیر الدین نے لکھا تھا:

''کشتی فن کا آزمودہ کار ملاح، تجربہ کار ناخدا اور اجمل خاں کا جانباز سپاہی چل بسا، وہ بڑا بہادر بڑا دلیر اور بڑا جنگ جو تھا، دلی رو رہی ہے، حیدر آباد اشک بار ہے، کراچی میں آنسو بہ رہے ہیں۔ حکیم الیاس خاں کہنے کو 82 برس کے تھے، مگر ان کے سینہ کے اندر، دل جوانوں کی طرح اچھلتا تھا، مرتے دم تک ان کی آواز میں پستی اور ارادوں میں شکستگی نہیں آنے پائی۔ ان پر جوانی آئی تو پھر واپس نہیں گئی''۔

مطالعاتی ماخذ

1۔ الواح الصنادید، عطاء الرحمان قاسمی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، نئی دہلی، 1989ء

2۔ رموز الحکمت، حکیم محمد عبدالرحیم جمیلؔ، اسٹیم پریس، گجرات، غیر مورخ

3۔ قانونِ عصری، حصہ اول، حکیم محمد الیاس خاں، جید برقی پریس، دہلی، 1931ء

4۔ دلی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو اکادمی، دہلی، اشاعت ثانی 2011ء

5۔ دستور العمل برائے بورڈ آف ٹرسٹیز آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج، وضع کردہ 15 اکتوبر 1915ء، ترمیم شدہ 26 اکتوبر 1925ء

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان

حکیم حبیب الرحمان اپنے شاندار طبّی کارناموں کی وجہ سے برطانوی عہد کی طبّی تاریخ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے پہلے مشرقی بنگال میں طبِ یونانی کی کوئی مستحکم روایت نہیں تھی۔ اُنہوں نے اس علاقہ کو طبِ یونانی سے منظم طور پر روشناس کروایا۔ اس وقت بنگلہ دیش کی طبّی تاریخ میں حکیم حبیب الرحمان کا وہی مرتبہ ہے، جو ہندوستان میں حکیم اجمل خاں کو حاصل ہے۔

حکیم حبیب الرحمان 1298ھ مطابق 1881ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان نسباً فاروقی اور وطناً یاغستانی علاقہ صوبہ سرحد کے مشہور قبیلہ یوسف زئی کے پٹھان طبقہ سے متعلق تھا۔

حکیم حبیب الرحمان کے والد مولانا محمد خان اخوندزادہ معروف بہ بادشاہ میاں بونیر، مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلی کے شاگردوں میں تھے اور دیوبند کے فارغ تھے۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی کے ہم سبق تھے۔

حکیم حبیب الرحمان نے کان پور میں درسیات کی تکمیل کی۔ ابتدائی صرف ونحو کے اسباق مولانا اشرف علی تھانوی سے پڑھے۔ اکثر درسیات مولانا محمد اسحٰق بردوانی سے پڑھی، مولانا احمد حسن کان پوری اور مولانا عبدالوہاب بہاری سے معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے حدیث کی تحصیل کی۔ اُس زمانہ میں یہ سارے علماء کان پور کے مدرسہ میں استاذ تھے۔

مزید تعلیم کے لیے آگرہ گئے، وہاں عربی زبان و ادب، اسلامیات اور علومِ عقلیہ وغیرہ میں اعلیٰ واقفیت بہم پہنچائی۔ 1899ء میں آگرہ میں حکیم آغا حسن سے کچھ طب کی کتابیں پڑھیں۔ مگر باقاعدہ تعلیم مدرسہ طبیہ دہلی سے حاصل کی، یہاں انہیں حکیم عبدالمجید خاں سے استفادہ کا موقع ملا۔

1904ء میں طب کی تعلیم مکمل کر کے ڈھاکہ واپس آئے۔ یہاں مطب و معالجہ کا سلسلہ شروع کیا اور بہت جلد عظمت و شہرت کے مالک بن گئے۔ وہ نواب بہادر سر سلیم اللہ آف ڈھاکہ کے طبیب خاص اور سیاسی مشیر بھی تھے۔

23-1922ء میں حکومت بنگال نے کلکتہ اور ڈھاکہ میں یونانی طب کی اشاعت کے سلسلہ میں ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ کرنل حسان سہروردی اس کے سکریٹری اور حکیم حبیب الرحمان رکن تھے۔ اس کمیٹی نے ڈھاکہ اور کلکتہ میں دو یونانی کالج قائم کرنے کی سفارش کی تھی، مگر اس پر حکومت نے کوئی توجہ نہیں دی۔ حکومت کی سرد مہری پر حکیم حبیب الرحمان نے ذاتی وسائل سے ایک طبیہ کالج کے قیام کا فیصلہ کیا اور کرایہ پر ایک عمارت لے کر 1930ء میں حبیبیہ طبیہ کالج قائم کیا۔ بنگلہ دیش کے اندر یونانی طب کی نشوونما میں اس کالج نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج بھی یہ کالج بنگلہ دیش میں یونانی طب کی نشر و اشاعت کر رہا ہے اور اس کا شمار وہاں کے اہم طبی اداروں میں ہوتا ہے۔ حکیم حبیب الرحمان نے بنگال اور آسام میں طبی کاز کے لیے ایک تنظیم "انجمن مشرقی بنگال و آسام" قائم کی تھی، جس کے وہ تاحیات صدر رہے۔

حکیم حبیب الرحمان نے تقریباً چالیس برس تک طبابت کی اور لاکھوں مریضوں نے ان کے ہاتھوں جامِ صحت نوش کیا۔ انہیں مرض کی تشخیص میں اتنا کمال حاصل تھا کہ صرف مریض کی آواز سن کر بہت سے امراض کی تشخیص کر لیتے تھے اور علاج بتلا دیا کرتے تھے۔

حکیم صاحب کی طبی حذاقت کا ایک واقعہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"کئی سال پہلے کی بات ہے میں نے ریڈیو پر ایک تقریر کی تھی، مرحوم نے ڈھاکہ سے لکھا کہ میں نے ریڈیو پر آپ کی آواز سنی جو آپ کے ضعفِ قلب کا اعلان کر رہی ہے، اس کی خبر جلد لیں، چنانچہ چند روز کے بعد ہی مجھے اسی قسم کے سخت مرض کا سانحہ پیش آیا، جس سے اللہ نے جانبری فرمائی"۔

حکیم حبیب الرحمان کی فنی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 1939ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے 'شفاء الملک' کا خطاب عطا ہوا تھا، جسے تحریکِ پاکستان کی خاطر انہوں نے 1946ء میں واپس کر دیا تھا۔

حکیم صاحب کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جس میں عربی، فارسی اور اردو زبان کی بیش قدر کتابیں تھیں، جو اُن کے انتقال کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری کو دے دی گئیں۔

طب کی طرح ادب کے میدان میں بھی ان کی حیثیت مسلم تھی۔ اُن کے دم سے ڈھاکہ میں علم وادب کی ایک دنیا آباد تھی، انہیں شاعری سے بھی ذوق تھا، احسنؔ تخلص کرتے تھے۔

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان نے مختلف موضوعات پر بیش قدر تالیفات یادگار چھوڑی ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1۔ ثلاثہ غسالہ:

اُن کی بہت اہم تصنیف ہے۔ اِس میں اُنہوں نے بنگال کے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کا تعارف پیش کیا ہے۔ کتاب شناسی کے حوالہ سے یہ بے حد اہم ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان سے 1989ء میں شائع ہوا ہے۔

2۔ الفارق:

یہ متشابہ امراض کی تفریق کے بیان میں ہے۔ یہ کتاب 1322 ہجری مطابق 1904ء میں شائع ہوئی ہے۔

3۔ حیاتِ سقراط: مطبوعہ 1322ھ مطابق 1904ء

4۔ رسالہ ترکِ موالات: مطبوعہ لکھنؤ 1920ء

5۔ آسودگانِ ڈھاکہ: مطبوعہ 1946ء

6۔ مساجدِ ڈھاکہ: غیر مطبوعہ

7۔ شعراءِ ڈھاکہ: غیر مطبوعہ

23 فروری 1947ء کو انہوں نے وفات پائی۔ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے فیض کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کی یادگار کے طور پر بنگلہ دیش میں حکیم حبیب الرحمان فاؤنڈیشن قائم کی گئی ہے، جو تعلیم و تحقیق اور رفاہ کی جہتوں میں کام کر رہی ہے۔ اس فاؤنڈیشن کا اہم مقصد یونانی ادویات پر تحقیق اور اس سلسلہ میں کام کرنے والے افراد کا تعاون ہے۔

یہ فاؤنڈیشن طبی تعلیم کے لیے ہونہار طلبہ کو اسکالرشپ دیتی ہے اور نمایاں کامیابی

حاصل کرنے والے طالب علموں کو حکیم حبیب الرحمان میڈل سے نواز کر اُن کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ عوامی حلقہ میں یونانی طب کو مقبول بنانے اور اس کی تشہیر کے لیے سیمپوزیم اور سیمینار جیسی تقریبوں کا اہتمام بھی کرتی ہے۔

اس فاؤنڈیشن نے شفاء الملک حکیم حبیب الرحمان کی حیات وخدمات پر بنگلہ زبان میں ایک کتاب شائع کی ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1- ہندوستان کے مشہور اطباء، حکیم حافظ سید حبیب الرحمان، ترقی اردو بیورو، دہلی، 2000ء

2- سفرنامۂ بنگلہ دیش، حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، 2006ء

3- شفاءالملک حکیم حبیب الرحمان، شائع کردہ حکیم حبیب الرحمان فاؤنڈیشن، بنگلہ دیش، غیر مورخ

شفاء الملک حکیم عبدالحمید

شفاء الملک حکیم عبدالحمید 24 محرم 1302 ہجری مطابق 24 اکتوبر 1884ء کو جمعہ کے روز پیدا ہوئے۔ اُن کے متعلق مولانا شاہ فضل الرحمان گنج مرادآبادی نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ مستقبل میں بہت بڑی شخصیت کے مالک ہوں گے۔ گنج مرادآبادی نے جس وقت یہ بشارت سنائی تھی اُس وقت حکیم عبدالحمید کی عمر محض چار پانچ برس تھی۔ شفاء الملک حکیم عبدالحمید نے اپنے تجرِ علمی، تجربہ رُفنی، بلند ہمتی اور معاملہ فہمی کی غیر معمولی صلاحیتوں سے یہ ثابت کردیا کہ وہ واقعی اپنے عہد کی عظیم شخصیت ہیں۔

شفاء الملک حکیم عبدالحمید نے عربی، فارسی، صرف ونحو، منطق وفلسفہ وغیرہ کی تعلیم اپنے والد حکیم عبدالعزیز کے تلامذہ سے حاصل کی اور علومِ حکمیہ کی اعلیٰ کتب، اعظم گڑھ کی دو مشہور شخصیتوں، مولانا حفیظ اللہ، ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے پڑھیں۔ درسیات کی تکمیل کے بعد خاندان کے موروثی فن کی طرف متوجہ ہوئے، اپنے بھائی حکیم عبدالرشید اور والدِ گرامی حکیم عبدالعزیز سے طبّی علوم کی تحصیل کی۔

حکیم عبدالعزیز نے فنِ طب میں علم جراحت کے احیاء کی ضرورت محسوس کرکے، اسے دوبارہ حلقۂ اطباء میں رواج دینے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس کی تکمیل میں حکیم عبدالحمید کا بڑا اہم حصہ ہے۔ حکیم عبدالحمید نے لکھنؤ اور آگرہ میں ڈاکٹر کرنل اینڈرسن سول سرجن سے تشریح اور جراحت کی علمی وعملی تربیت حاصل کی اور اس فن میں مشق ومزاولت کے ذریعہ دستگاہ پیدا کی۔ ڈاکٹر اینڈرسن نے حکیم عبدالحمید کی فنی تربیت کرکے 18 مارچ 1902ء کو انہیں سرجن کا سرٹیفکٹ عطا کیا، اس طرح اپنے برادر بزرگ شفاء الملک حکیم عبدالرشید کے بعد وہ دوسرے سندیافتہ طبیب سرجن ہیں۔

شفاء الملک حکیم عبدالرشید اور شفاء الملک حکیم عبدالحمید نے جدید سرجری کی تعلیم اور سند حاصل کر کے ہندوستان کی طبی تاریخ میں ایک نئی مثال قائم کی تھی۔ ان سے پہلے سرجری کا فن ڈاکٹروں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ حکیم عبدالحمید کو جنرل سرجری کے ساتھ کیٹریکٹ کے آپریشن میں ملکہ حاصل تھا، گویا وہ جنرل سرجن کے ساتھ ایک اچھے آئی سرجن بھی تھے۔ مدیر خادم الاطباء حکیم عبدالمعید لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس فن میں اتنی اعلیٰ صلاحیت پیدا کر لی تھی کہ بہت سے آپریشن، جدید علمِ جراحت کے ماہرین سے بھی بہتر کرتے تھے۔

جراحت کے ساتھ وہ مطب و معالجہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ معاصرین میں ایک حاذق طبیب کی حیثیت سے ان کی شہرت تھی۔ ان کے مطب کا شمار بڑے مطبوں میں ہوتا تھا۔ ان کے دستِ شفاء، مہارتِ فن، بے مثل تشخیص و تجویز کا دور دور تک شہرہ تھا۔ مطب پر مریضوں کے ہجوم کے باوجود وہ مریضوں سے نہایت خوش خلقی سے پیش آتے۔ ان کے مطب پر امیر و غریب اور ہندو، مسلمان ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جاتا تھا۔

حکیم محمد مسیح الزماں ندوی نے شفاء الملک حکیم عبدالحمید کے معمولات اور افادات کو 'مطبِ حمید' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ ماہنامہ تکمیل الطب کی اشاعتِ خاص کے طور پر 1949-50ء میں یہ مطب طبع ہوا ہے۔ حکیم عبدالحمید کے یہ افاداتِ مطب، سر سے پیر تک کے جملہ امراض پر مشتمل ہیں۔

مطب حمید میں شامل افادات درج ذیل عناوین کے تحت بیان کیے گئے ہیں۔

امراضِ رأس، امراضِ عین، امراضِ اُذن، امراضِ انف، امراضِ لسان، فم و شفتین، امراضِ اسنان و لثہ، امراضِ حلق، امراضِ صدر و ریہ، امراضِ ثدی، امراضِ قلب، امراضِ معدہ، امراضِ کبد، امراضِ مرارہ، امراضِ طحال، امراضِ امعاء، امراضِ گردہ و مثانہ و احلیل، امراضِ اعضاءِ تناسل مردانہ، امراضِ اعضاءِ تناسل زنانہ، امراضِ اعضاءِ ظاہرہ، اورام و بثور، حمیات، منضجات و مسہلات، مجرباتِ خصوصی، امراضِ مخصوصہ مرداں۔

'مطبِ حمید' شفاء الملک حکیم عبدالحمید کے مجربات و معمولات کا مجموعہ ہے۔ یہ قرابادینی ذخیرہ کا بڑا اہم سرمایہ ہے۔ مسیح الزماں ندوی نے ان افادات کو امراض کے لحاظ سے

مرتب کر کے نہ صرف اس کے افادے کو عام بنایا ہے، بلکہ اسے علمی انداز میں پیش کر کے ایک اہم قرابادینی ضرورت اور مرکبات کی ترتیب و تالیف میں ایک ضروری منہج کی طرف اطباء کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس لیے کہ یونانی طب کے بیشتر قرابادینی مجموعے حروف تہجی کی ترتیب پر تالیف کیے گئے ہیں۔

'مطب حمید' کے نسخوں میں نہ تو دواؤں کی کثرت ہے اور نہ ہی ان میں ایسی دوائیں ہیں، جن کا ملنا دشوار ہو، بلکہ ان کے اجزاء سہل الحصول ہیں اور قلیل اجزاء پر مشتمل ہیں۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ نسخے نہایت زود اثر ہیں۔ مطب و معالجہ کے حوالے سے یہ مجموعہ نہایت قابلِ قدر ہے۔

حکیم عبدالحمید کو اپنے والد ماجد کی طرح درس و تدریس اور کتب بینی کا بے حد شوق تھا۔ مطب و معالجہ اور انتظام و انصرام کی مشغولیات کے علاوہ علمی اور تدریسی مشاغل ہمیشہ ان کی مصروفیات کا حصہ رہے۔ شام کا وقت طلبہ کی تعلیم کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ وہ درس اس خوبی سے دیتے تھے کہ متقدمین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ کتاب کے مشکل مقامات کے حل میں اُنہیں کمال حاصل تھا۔ درس کے دوران ان کی کوشش رہتی تھی کہ تلامذہ کتاب کے مطالب پر پورا عبور حاصل کر لیں۔

درس و تدریس میں مہارت کی وجہ سے ان کا طریقۂ تعلیم نہایت جاذب تھا۔ ان کے شاگرد حکیم شکیل احمد شمسی رسالہ 'حمیات' میں لکھتے ہیں:

> "1933ء کا واقعہ ہے کہ مرحوم شفاء الملک حکیم عبدالحمید صاحب سے میں نے عملیۂ نزول الماء سیکھنا شروع کیا، مرحوم نے کامل الصناعۃ سامنے رکھ کر جب اس عملیہ پر لیکچر دیا تو میری حیرت کی انتہا نہیں تھی مرحوم نے قدیم انداز کے بجائے اس کی تعبیر و تشریح اس انداز سے کی کہ وہ کیٹریکٹ کے ماڈرن آپریشن کا بیان بن گیا۔ اس وقت سے متقدمین کی کتابوں پر مجھے غیر مقلدانہ غور کرنے کی عادت ہوگئی"۔

راقم کا خیال ہے کہ ہمارے عہد کے یونانی اساتذہ کو طبی مضامین کی تدریس کے وقت اس نکتہ کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے زمانہ کے اساتذہ جس انداز میں یونانی طب کی

تعلیم دیتے ہیں، اس سے طلبہ کے اندر فن کے تئیں اعتماد کے بجائے بدظنی اور رغبت ودلچسپی کے بجائے تنفر پیدا ہوتا ہے اور غالباً اساتذہ کے اسی طرزِ تدریس کے باعث طبیبوں کی نوجوان نسل یونانی طب سے بیزار اور جدید طب کی گرویدہ ہوتی جارہی ہے۔

1920ء میں حکیم عبدالرشید کے انتقال کے بعد شفاء الملک حکیم عبدالحمید، تکمیل الطب کے آنریری سکریٹری مقرر ہوئے۔ ان کے دورِ انتظام میں بہت سے قابلِ ذکر کام انجام پائے۔ منصبِ اہتمام پر فائز ہونے کے بعد انہوں نے کالج کے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں تبدیلی کی اور تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے اصلاحی اقدامات کیے۔ مثلاً کلیات کی نظری تعلیم کے ساتھ عملی مشق کا انتظام کیا۔ نبض کے معائنہ اور قارورہ کے مشاہدہ کا طلبہ کے لیے اہتمام کیا۔ جب کہ ہمارے دور میں کلیات کی تعلیم صرف نظری مباحث تک محدود ہے۔

حکیم عبدالحمید نے معالجات کی کتابی تعلیم کے ساتھ طلبہ کے لیے مریضوں کے معائنہ، امراض کی تشخیص اور نسخہ نویسی کی تربیت کو تعلیم کا حصہ قرار دیا۔ علم تشریح کی تعلیم کے لیے ڈِیکشن ہال تعمیر کروایا اور لاشوں کے حصول کا انتظام کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے بغیر سرجری کی تعلیم جو کہ تکمیل الطب کالج کے نصب العین کا ایک اہم حصہ ہے، ادھوری اور نامکمل ہے۔

1928ء میں حکیم عبدالحمید نے کالج کے لیے ایک نیا نصاب مرتب کیا، جس میں تین سال کی تعلیم کے علاوہ چوتھے اختیاری سال کا بھی اضافہ کیا۔ یہ سال 'درجۂ تبحر' کہلاتا تھا۔ دراصل یہ تخصص کا درجہ تھا، جس میں علم الجراثیم، سرجری، فرسٹ ایڈ، میڈیکل جیورس پروڈنس اور سائنس کے دیگر مضامین کی تعلیم کا اہتمام تھا۔ طب کے ان مضامین کو نصاب کا جزء بنانے کے باوجود یہ خیال ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا کہ جدید مضامین کا حصہ قدیم مضامین سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

طب کی تعلیمی زبان کے لیے انہوں نے ہمیشہ عربی زبان کی وکالت کی۔ ان کے ایما پر 1925ء میں حکیم عبدالحلیم نے 'طب کی تعلیمی زبان' کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس میں طب کو عربی زبان میں پڑھائے جانے کی پرزور وکالت کی گئی تھی۔ 1939ء میں طبی درس گاہوں کے لیے ایک متفقہ نصاب مدون کرنے کے لیے 'انجمن طبیہ' کے زیر اہتمام جب لکھنؤ میں اطباء کا نمائندہ اجلاس ہوا، تو انہوں نے طب کی تعلیمی زبان عربی رکھے جانے پر شدید اصرار کیا۔ حالانکہ

اس زمانہ میں اکثر طبی درس گاہوں میں یونانی طب کو اردو میں پڑھانے کا رواج شروع ہو چکا تھا اور اردو زبان اس وقت علمی اور عوامی دونوں حلقوں میں رواج پا چکی تھی۔ اسی وجہ سے حکیم اجمل خاں، عربی کے بجائے اردو کو فنی زبان کے طور پر رائج کرنے کی وکالت کر رہے تھے اور انہوں نے اردو زبان میں طبی نصاب کی تیاری کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔

حکیم عبدالحمید نے نصابی اور تعلیمی اصلاحات کے ساتھ، تکمیل الطب کے مالی حالات پر خاص توجہ کی اور والیانِ ریاست اور تعلقداروں سے روابط استوار کر کے کالج کے تعاون کے ذرائع پیدا کیے۔ اُن کے دور میں تکمیل الطب میں کئی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور کالج مالی طور پر مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہوا۔

شفاء الملک حکیم عبدالحمید، آیورویدک اور ایلوپیتھی سے یونانی طب کے اختلاط کو مضر سمجھتے تھے اور ہمیشہ اُنہوں نے اس نظریہ کی مخالفت کی۔ خصوصاً علم الجراثیم، علم الامراض (پیتھالوجی) کے جدید طبی نظریہ کو وہ یونانی طب کے فلسفہ سے متصادم اور اس کے خلاف تصور کرتے تھے۔ حکیم عبدالحمید کے علاوہ لکھنؤ کے دوسرے اطباء بھی اسی خیال کے حامی تھے۔

شفاء الملک حکیم عبدالحمید نہایت فعال شخصیت کے مالک تھے۔ اُنہوں نے اپنے عہد کی طبی تحریکوں میں نہایت سرگرم حصہ لیا۔ اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ، اسٹیٹ ایڈیڈ طبی اسکول لکھنؤ، پٹنہ طبی اسکول بہار، نظامیہ طبی کالج حیدرآباد کے قیام کی تحریکوں اور ان کے تعلیمی نصاب اور یہاں لائق اساتذہ کی تقرریوں کے سلسلہ میں اُنہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

حکیم عبدالحمید کا یہ بہت اہم کارنامہ ہے کہ ان کی کوششوں سے طبی کانفرنس کے مسئلہ پر دہلی اور لکھنؤ کے اختلافات دور ہوئے اور لکھنؤ اور دلّی کے درمیان فن کی ترقی کے لیے مشترکہ جدوجہد کے امکانات پیدا ہوئے۔

1925ء میں صوبۂ اُتر پردیش میں بورڈ آف انڈین میڈیسن کے قیام کی تحریک اور بورڈ کے مختلف منصوبوں کے سلسلہ میں حکیم عبدالحمید نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ نہایت قابل قدر ہیں۔

1936ء میں وہ تکمیل الطب کالج کے جملہ انتظامات، حکیم عبدالمعید کے سپرد کر کے حجِ

بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ 1937ء میں واپسی پر حکیم عبدالمعید نے انتظامات واپس کرنا چاہا، مگر انہوں نے اسے منظور نہیں کیا۔

حکیم عبدالحمید کو ان کی طبی خدمات کے صلہ میں 3 جون 1925ء کو 'شفاء الملک' کا خطاب عطا کیا گیا۔

مرضِ سل میں مبتلا ہو کر 57 برس کی عمر میں 24 دسمبر 1940ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور دوسرے دن خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ تکمیل الطب، لکھنؤ، جلد 1، شمارہ 5، دسمبر 1947ء

2۔ خادم الاطباء (ماہانہ)، جلد 1، شمارہ 2، جون 1919ء

3۔ 'مطب حمید' تکمیل الطب، لکھنؤ، مرتبہ مسیح الزماں ندوی، جلد 3، شمارہ 9-5، دسمبر 1949ء تا اپریل 1950ء

4۔ تذکرۂ خاندانِ عزیزی، حکیم سید ظل الرحمان، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ، اشاعتِ دوم 2009ء

5۔ تذکرۂ اطباءِ اودھ، حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، ادارہ ادبیات، دلّی، 2008ء

حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہرؔ

حکیم محمد ہادی رضا خاں ایک قدیم طبی سلسلہ کے فرد ہیں، اُنہیں طب اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی۔ اُنہوں نے نہ صرف اس میراث کو سنبھالا، بلکہ خاطر خواہ اضافہ کے ساتھ اسے ایک مضبوط بنیاد عطا کی۔

حکیم محمد ہادی رضا خاں کے مورثِ اعلیٰ حکیم محمد علی رضا مشہور طبیب گزرے ہیں، جو کشمیر سے لکھنؤ آکر آباد ہوئے تھے۔ حکیم محمد ہادی رضا کے دادا حکیم مولوی محمد حسن رضا خاں، صاحبِ تالیف وتصنیف اور ممتاز طبیب تھے اور والد حکیم محمد حسین رضا خاں اپنے عہد کے عالی مرتبت طبیبوں میں تھے۔ انہوں نے ریاستِ رامپور میں افسر الاطباء کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہیں۔

حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہِ محرم 1306 ہجری مطابق اکتوبر 1885ء میں پیدا ہوئے۔ مروجہ علوم کی تحصیل مولوی غلام محمد پنجابی، مولانا فضلِ حق رام پوری اور مولانا عبدالغفار خاں رام پوری سے کی اور طبی علوم اپنے والد سے حاصل کیے۔

1909ء میں اپنے والد حکیم محمد حسین رضا خاں کے انتقال کے بعد مسند نشین ہوئے اور ان کے مطب ومعالجہ اور درس وتدریس کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ انہیں فارسی اور پشتو میں مہارت حاصل تھی۔ افغانی طلبہ سے وہ پشتو ہی میں بات کرتے تھے۔ وہ اپنے طلبہ کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے، ایک بار ایک افغانی طالب علم کو قانونِ شیخ کا کوئی مسئلہ سمجھا رہے تھے، دو گھنٹہ مسلسل کتاب کی ایک لائن پر لکچر دیا، دوسرے اور تیسرے دن بھی اسی مسئلہ پر تقریر کی، ان کے بیٹے حکیم صابر سے جب رہا نہ گیا تو وہ سوال کر بیٹھے کہ آپ نے ایک مسئلہ سمجھانے میں تین دن صرف کردیے، اس پر انہوں نے فرمایا کہ یہ طلبہ بہت دور سے میرے پاس تحصیلِ علم کے لیے

آئے ہیں۔ میرا فرض ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں جو بھی میری معلومات ہیں، ان کو بتادوں، اگر درس دینے میں بخل کروں گا تو یہ بے چارے کس سے اور کہاں علم حاصل کریں گے؟۔

حکیم محمد ہادی رضا خاں سے استفادہ کرنے والے طلبہ کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ ہے۔ ملک و بیرون ملک کے مختلف حصوں یوپی، بہار، پنجاب، بنگال، اڑیسہ، ممبئی، مدراس، کلکتہ، حیدرآباد دکن، صوبہ سرحد، افغانستان، کابل، یاغستان، میمند، قندھار، بخارا وغیرہ کے طلبہ اُن سے مستفید ہونے والوں میں شامل ہیں۔

لکھنؤ کے دوسرے طبیبوں کی طرح ہادی رضا خاں کو بھی یونانی طب میں جراحت کی کمی کا احساس تھا۔ لہٰذا انہوں نے لکھنؤ میڈیکل کالج کے ایک انگریز سرجن کی نگرانی میں جراحت کی تعلیم حاصل کی۔ اُن کے مطب کے ایک حصہ میں آپریشن تھیٹر قائم تھا، جس میں طلبہ کی موجودگی میں وہ پابندی سے آپریشن کرتے تھے۔ اُن کے آپریشن روم میں ہزاروں روپے کے قیمتی جراحی آلات، جرمن اور ولایت سے منگائے گئے تھے۔ سرجری میں مہارت کی وجہ سے حکومت کی طرف سے انہیں باقاعدہ مارفین، کوکین اور کلوروفارم جیسی ادویات کے استعمال کی تحریری اجازت حاصل تھی۔

جنرل سرجری کے علاوہ آنکھوں کے آپریشن کا انہیں اچھا تجربہ تھا۔ وہ فصد میں بھی ماہر تھے اور بہت کامیابی کے ساتھ اسے کرتے تھے۔ وہ یونانی طریقۂ علاج میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ طاعون کے علاج میں انہیں بڑی شہرت حاصل تھی۔ 'القانون فی علاج الطاعون' کے نام سے اردو زبان میں انہوں نے ایک رسالہ بھی تالیف کیا تھا۔

حکیم محمد ہادی رضا خاں نے طاعون سے تحفظ کے لیے 'الحیات' نام کی ایک ڈبیہ ایجاد کی تھی، جسے پاس رکھنے سے طاعون کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ 'قرابادین رضائی' پر اس دوا کا ایک اشتہار راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ اس کی قیمت دو آنہ فی ڈبیہ تحریر ہے۔

منبع الطب کالج کے سلسلہ میں حکیم محمد ہادی رضا کی مساعی بے حد اہم ہیں۔ آخر عمر تک وہ اس کے سکریٹری رہے اور دسمبر 1929ء تک اس کے پرنسپل کے طور پر خدمات انجام دیں۔

جون 1933ء میں انہوں نے 'الطبیب' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ یہ چند برس پابندی سے جاری رہا۔ مئی 1947ء میں ان کے صاحبزادے حکیم صابر رضا نے دوبارہ اس کی

اشاعت شروع کی۔

طب کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اُنہوں نے ہمیشہ کوششیں کیں اور یونانی طب کے تحفظ اور طبیبوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے تاحیات سینہ سپر رہے۔ میونسپل کمشنر کی حیثیت سے طبّی مفاد کے لیے ان کی کوششوں کے نتیجہ میں محکمۂ حفظانِ صحت میونسپل بورڈ لکھنؤ نے، دیسی طبوں کے حاملین کو صحت اور بیماری کا سرٹیفکٹ دینے کا مجاز قرار دیا۔

حکیم محمد ہادی رضا آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبّی کانفرنس کے بہت فعال رکن تھے۔ کانفرنس کے چھٹے اجلاس منعقدہ رام پور 1916ء کے انتظام و انصرام میں بہت سرگرمی سے انہوں نے حصہ لیا، 18 دسمبر 1927ء کو انہوں نے پنجاب طبّی کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی تھی۔ طبّی تحریک کے ساتھ آزادی کی تحریک سے بھی ان کا تعلق تھا۔

مریضوں کے ساتھ حکیم ہادی رضا کا رویہ بہت ہی ہمدردانہ تھا، اُن کے بیٹے حکیم محمد صابر رضا ادیب ایک واقعہ لکھتے ہیں:

> ''1935ء کی بات ہے کہ والد صاحب قبلہ کے مطب میں ان کے ایک پرانے مریض مرزا صاحب حیران و پریشان آئے، اس وقت حکیم صاحب مریضوں کو دیکھنے میں مشغول تھے۔ مرزا صاحب نے عرض کیا کہ قبلہ میری بچی کی طبیعت بہت خراب ہے آپ اس کو ملاحظہ فرمالیں، تھوڑی دیر بعد والد صاحب، مرزا صاحب کے ہمراہ ان کے گھر گئے۔ نصف گھنٹہ بعد مطب پر واپس آئے۔ میں مطب میں موجود تھا، مجھ سے فرمایا کہ صابر ایک پیالہ بکری کے شوربے کا جلد انتظام کرو، حسبِ حکم میں نے اس کا انتظام کر دیا، والد صاحب نے اسے مرزا صاحب کے گھر بھجوادیا، جب مطب میں مریضوں کا سلسلہ ختم ہوا اور طلبہ بھی چلے گئے تو میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ قبلہ! مریض کے گھر کھانا بھجوانے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟۔ انہوں نے فرمایا کہ مرزا صاحب کی لڑکی جس کو وہ ابھی دیکھ کر آئے ہیں، ٹی بی کی مریضہ ہے، اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا

کھاؤں؟، میں نے اس کو بتایا کہ بکری کا شوربہ اور چپاتی کھاؤ، اس نے کہا کہ حکیم صاحب میں آپ کے گھر کا شوربہ کھانا چاہتی ہوں، یہ مریضہ چند گھنٹوں کی مہمان ہے، اگر میں نے اس کی خواہش پوری کردی تو میرا کیا نقصان ہوگیا"۔

حکیم ہادی رضا کو شعروادب سے بھی دلچسپی تھی، وہ ماہر تخلص کرتے تھے۔ 'مجموعۂ کلام ماہر' ان کا شعری مجموعہ ہے، جسے ان کے صاحبزادہ حکیم محمد صابر رضا ادیب نے دسمبر 1969ء میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

مرکبات، مفردات، طبی مصطلحات اور مختلف طبی موضوعات پر انہوں نے جو کتب ورسائل تالیف کیے ہیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1۔ قرابادین رضائی:

حکیم محمد ہادی رضا کی مشہور تالیف ہے، اسے انہوں نے فارسی زبان میں 1907ء میں تالیف کیا تھا۔ یہ 1912ء میں مطبع ریاست رام پور سے شائع ہوئی تھی۔ یہ قرابادین 56 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل مؤلف کے والد، اساتذہ اور خود ان کے تالیف کردہ نسخوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں مختلف کتابوں میں مذکور ایسے مرکبات بھی شامل ہیں، جنہیں مؤلف نے خود آزما کر اُن کے اثرات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اُنہوں نے یہ قرابادین اپنے چھوٹے بھائی حکیم محمد حبیب رضا کے لیے تالیف کی تھی۔ 13 ابواب اور متعدد فصلوں میں ہادی رضا نے سیکڑوں مرکبات کی تفصیل، اس میں جمع کی ہے۔ مؤلف نے حل لغات کے ساتھ مرکبات کی وجہ تسمیہ اور ان کے مخترعین اور واضعین کے ناموں کے حوالوں کا اہتمام بھی کیا ہے۔

2۔ القانون فی علاج الطاعون:

یہ رسالہ اردو زبان میں 1908ء میں تالیف کیا تھا، 1916ء میں طبی کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر حکیم اجمل خاں نے اس رسالہ پر دستخط کر کے سندِ پسندیدگی عطا کی تھی۔

3۔ اصطلاحات الاطباء:

اس میں مؤلف نے قدیم طبی مصطلحات کی توضیح کی ہے۔

4۔ قانونِ مطب:

اس میں مطب و معالجہ سے متعلق اصول وضوابط تحریر کیے گئے ہیں۔ 1936ء میں یہ رسالہ دوسری بار شائع ہوا تھا، یہ چار حصوں میں منقسم ہے۔

5۔ عجائب المفردات:

اس میں ایسی مفرد دواؤں کے افعال وخواص اور شناخت بیان کی ہے، جن کا ذکر کتبِ مفردات میں کم ملتا ہے۔

6۔ القول الکامل فی زحیر الحق والباطل:

اس میں زحیر سے متعلق تفصیلات درج ہیں، یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔

7۔ مصباح المشائخ: یہ رسالہ 1928ء میں شائع ہوا ہے۔

حکیم محمد ہادی رضا خاں منبع الطب کالج کے سلسلہ میں رام پور گئے ہوئے تھے، وہیں ہیضہ کا حملہ ہوا، لکھنؤ واپس آتے ہوئے بریلی میں 20 جون 1943ء کو سفر آخرت اختیار کیا، لاش لکھنؤ لا کر دفن کی گئی۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ مجموعۂ کلام ماہر، مرتبہ حکیم محمد صابر رضا ادیبؔ، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، 1969ء

2۔ قرابادین رضائی، حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہرؔ، مطبع ریاست رام پور، 1912ء

3۔ تذکرہ کاملانِ رام پور، حافظ احمد علی خاں شوقؔ، ہمدرد پریس، دہلی، 1929ء

4۔ رموز الاطباء، حکیم فیروز الدین، لاہور، 1915ء

حکیم محمد کبیر الدین

ہندوستان کی علمی تاریخ میں صوبۂ بہار کو ایک اہم اور قدیم مرکز کا درجہ حاصل ہے۔ اس صوبہ کے ضلع مونگیر کا شمار مسلم مردم خیز اضلاع میں ہوتا ہے۔ حکیم محمد کبیر الدین اسی ضلع کے قصبہ شیخ پورہ میں 13 اپریل 1894ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد 1905ء میں صرف گیارہ برس کی عمر میں اپنے منجھلے بھائی حکیم محمد ظہور الدین کے ساتھ کان پور آ گئے۔ یہاں تقریباً دو برس رہ کر عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں ان کے اساتذہ میں مولانا عبید اللہ کانپوری اور مولانا احمد حسن کانپوری کے اسماء خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

1907ء میں حکیم محمد کبیر الدین لکھنؤ آئے۔ یہاں کنگ کالج میں مولانا عبد المجید فرنگی محلی سے بطور خاص اکتساب فیض کیا۔ اس وقت کے مشہور خوش نویس شمس الدین اعجاز رقم سے فنِ کتابت سیکھی۔ اپنے بھائی ظہور الدین کے ساتھ تکمیل الطب میں داخل ہوئے، لیکن یہاں کے نصاب اور طریقۂ تعلیم سے مطمئن نہ ہو کر 1909ء میں مدرسہ طبیہ دہلی میں داخلہ لیا، جہاں حکیم عبد الرشید رامپوری (استاذ کلیات)، حکیم عبد الرحمان پنجابی (استاذ معالجات)، حکیم عبد الرزاق پیرجی (استاذ تشریح)، ڈاکٹر امیر چند (استاذ مضامینِ جدیدہ) تدریس پر مامور تھے۔ ان مستقل اساتذہ کے علاوہ حکیم محمد احمد خاں اور حکیم غلام کبریا خاں، جز وقتی استاذ کے طور پر یہاں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ حکیم محمد کبیر الدین نے ان اساتذہ کے علاوہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے عملی طب کی تحصیل کی۔ انہوں نے یہاں طب کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اس مدرسہ کے طبی تحریکی اثرات بھی اخذ کیے تھے۔

مدرسہ طبیہ کی طالب علمی کے زمانہ میں حکیم محمد کبیر الدین نے حکیم اجمل خاں کے جو فکری اثرات قبول کیے تھے، اس کا نقش ان کی شخصیت میں تاحیات نمایاں رہا۔ اس زمانہ میں

حکیم اجمل خاں یونانی طب کی اصلاح وتجدید کے حوالہ سے اردو زبان میں اس کی تعلیم اور مغربی طب کے حصہ 'تشریح وجراحت کی یونانی نصاب میں شمولیت، فن طب کو معاصر علمی اسلوب میں پیش کرنے کی غرض سے، طبّی درس گاہوں میں جدید مضامین کی تعلیم کے حامی اور مبلغ تھے۔ حکیم اجمل خاں کے ان فکری اور تحریکی اثرات کو حکیم محمد کبیر الدین نے بدرجۂ اتم قبول کیا تھا۔ مدرسہ طبیہ میں ان کی جو ذہنی تربیت ہوئی تھی، زندگی بھر اس فکر کی تبلیغ کرتے رہے۔

حکیم محمد کبیر الدین نے مدرسہ طبیہ سے فراغت کے بعد تحصیل مزید کے لیے لاہور کا قصد کیا اور وہاں سے زبدۃ الحکماء کی سند حاصل کی۔ وہ نہایت ذہین طالب علم تھے۔ دلّی اور لاہور دونوں جگہوں پر ان کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شاندار رہا۔ مدرسہ طبیہ میں وہ یونانی مضامین میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے 'شیو پرشاد بہادر میڈل' اور جدید مضامین میں اوّل پوزیشن کے لیے 'شمس الاطباء میڈل' سے نوازے گئے تھے۔ جس سال حکیم محمد کبیر الدین زبدۃ الحکماء کے امتحان میں شریک ہوئے تھے، اس میں کامیاب ہونے والے وہ اکیلے طالب علم تھے۔ اُنہیں اس کامیابی پر 'سر لوٹی ڈین تمغہ' سے نوازا گیا تھا۔

حکیم محمد کبیر الدین کو اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبان میں مہارت حاصل تھی۔ حکمت وفلسفہ کا انہیں گہرا شعور تھا۔ یونانی طب کے قدیم مباحث کے علاوہ جدید طبّی مضامین کی بھی وہ بصیرت رکھتے تھے۔ ان لسانی اور فنی علوم کی مجموعی معرفت کی وجہ سے طب کی علمی تحقیق (لٹریری ریسرچ) کا شعبہ ان کی شخصیت کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ اس کی طرف ان کا طبعی میلان بھی تھا۔

لاہور میں 'زبدۃ الحکماء' کی سند حاصل کرنے کے علاوہ مدرسہ نعمانیہ میں داخل ہو کر انہوں نے عربی ادب کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ اس دوران لاہور میڈیکل کالج میں آمد ورفت کا سلسلہ بھی رہا، یہاں اُنہوں نے علمِ تشریح میں عملی مشق بہم پہنچائی۔

لاہور کے زمانۂ قیام میں پنڈت ٹھاکر دت شرما کے یہاں ترجمہ وتالیف کے شعبہ میں ملازمت کرنے کے علاوہ شمس الاطباء حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی کے شعبۂ تالیف وتصنیف میں بھی ملازم رہے۔ پھر اس ملازمت سے سبک دوش ہو کر 'فیضِ کبیر' کے نام سے مطب قائم کیا۔ یہاں علاج ومعالجہ کے علاوہ فارغ اوقات میں طلبہ کو موجز، نفیسی، سدیدی، شرحِ اسباب اور قانونِ شیخ کا درس بھی دیتے تھے۔

لاہور میں قیام کے دوران اُنہیں علم ہوا کہ مسیح الملک کے ذہن میں یونانی نصابِ تعلیم کی تیاری سے متعلق ترجمہ وتالیف کی ایک اسکیم زیرِ غور ہے۔ حکیم محمد کبیر الدین نے اس شعبہ میں اہلیت کے ثبوت کے لیے شرحِ اسباب کا اردو ترجمہ کر کے مسیح الملک کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کی ورق گردانی کے بعد مسیح الملک کا ارشاد ہوا:

''میں چاہتا ہوں کہ تم اس شعبہ میں مؤلف اوّل کے طور پر کام کرو، جدید تنظیم کے تحت ترجمہ وتالیف کا ایک صیغہ کھولا جارہا ہے''۔

حکیم محمد کبیر الدین طبیہ کالج کے اس نئے شعبہ سے وابستہ ہوئے اور فنِ تمریض (تیمارداری کے اصول وقواعد) کے موضوع پر ایک کتاب کی تالیف کا کام ان کے سپرد ہوا۔

16 مئی 1917ء کو پیرجی حکیم عبدالرزاق کے انتقال کے بعد آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج دہلی میں تشریح کے استاذ مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں قدیم تشریح، عربی زبان میں اور جدید تشریح، انگریزی اصطلاحات کے ساتھ اردو زبان میں پڑھائی جاتی تھی۔ تشریح کی یہ دورنگی تعلیم، طلبہ کے لیے ذہنی انتشار کا موجب تھی۔ حکیم محمد کبیر الدین نے 'تشریح کبیر' تالیف کر کے قدیم اور جدید تشریحی معلومات یکجا کر کے اس مضمون کی تعلیم کے لیے بڑی آسانی پیدا کردی۔ 'تشریح کبیر' کی تالیف، طبی ترجمہ نگاری کے حوالہ سے حکیم محمد کبیر الدین کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ جدید تشریحی اصطلاحات کی پابندی کے ساتھ طبی ترجمہ نگاری کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

حکیم محمد کبیر الدین کا ایک اہم کارنامہ 'دفتر المسیح' کا قیام اور رسالہ 'المسیح' کا اجراء ہے۔ یہ رسالہ 1921ء میں جاری ہوا اور آٹھ سال تک جاری رہنے کے بعد 1928ء میں بند ہوا۔

'دفتر المسیح' کا شمار یونانی کتب کے اہم تالیفی وتصنیفی اور اشاعتی اداروں میں ہوتا ہے۔ حکیم محمد کبیر الدین ادارہ المسیح کے ناظم اور حکیم عبدالواحد نائب ناظم تھے۔ ان کے علاوہ اور کئی حضرات اس ادارہ سے وابستہ تھے۔ مثلاً حکیم سید محمد یوسف نیّر، حکیم محمد صدیق اور حکیم حبیب اللہ وغیرہ۔ نیز حکیم یحییٰ خاں پٹنہ، حکیم خواجہ رضوان احمد اور ڈاکٹر محمد عثمان کا بھی علمی تعاون اس ادارہ کو حاصل رہا ہے۔ اس ادارہ کے قیام سے اردو زبان میں طب کی نصابی کتابوں کی تیاری اور اشاعت

میں بڑی مدد ملی اوراس کی مساعی سے یونانی طب کا ایک جامع نصاب اردو میں تیار ہوسکا۔

حکیم محمد کبیرالدین کے نام سے منسوب، اس ادارہ کی مطبوعات کے سلسلہ میں علمی حلقہ میں بڑی چہ می گوئیاں ہیں اوران کے نام سے ان کتابوں کے انتساب کے سلسلہ میں شک وشبہہ کا اظہار کیا گیا ہے مثلاً حکیم محمد مختار اصلاحی کسی قدر دبے لفظوں میں لکھتے ہیں:

> "اُنہوں نے (حکیم کبیرالدین) عربی کتابوں کے تراجم اور طبّی اصطلاحات میں اتنی مہارت پیدا کرلی تھی کہ یہ کام ان کے لیے بہت آسان ہوگیا تھا، دوسروں سے کام لینے کا بھی اُنہیں بہت اچھا ملکہ تھا، اپنی نگرانی میں کئی اچھے ترجمے دوسروں سے بھی کروائے"۔

حکیم سید ظل الرحمان نے اس کا اظہار بہت کھل کر کیا ہے۔ان کے مطابق اس ادارہ کی بیشتر کتابیں حکیم عبدالواحد نائب ناظم ادارۂ المسیح کی تالیف کردہ ہیں اوراس ادارہ کی جو کتابیں مؤلف کے نام سے خالی ہیں یا جن پر صرف 'ناشر دفتر المسیح' لکھا ہوا ہے، وہ سب حکیم عبدالواحد کے قلم کی رہینِ منت ہیں۔حکیم وسیم احمد اعظمی اور حکیم برکت اللہ ندوی وغیرہ نے اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ان لوگوں نے اپنے مقالوں میں کئی ایسے ناموں کی نشاندہی کی ہے، جن سے حکیم محمد کبیرالدین اپنے علمی کاموں میں تعاون لیا کرتے تھے اور جس کا اظہار حکیم محمد کبیرالدین نے بھی کیا ہے۔

راقم کا خیال ہے کہ ادارہ المسیح نشرواشاعت کے ساتھ ترجمہ وتالیف کا ادارہ تھا، حکیم محمد کبیرالدین اس کے سربراہ اور مہتمم تھے۔یہاں اُن کے زیرِ نگرانی ادارے سے وابستہ معاونین ترجمہ وتالیف کے کاموں میں ان کا تعاون کرتے تھے۔حکیم محمد کبیرالدین علمی رہنمائی کے ساتھ خود بھی ان کاموں میں شریک ہوتے تھے، لہٰذا ان کے نام سے ادارہ کے کاموں کا انتساب بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ آج کل علمی اداروں میں جاری پروجیکٹ کے کاموں کو اس کے انوسٹی گیٹر سے موسوم کرنے کا دستور ہے۔حالانکہ پروجیکٹ میں انوسٹی گیٹر صرف نگرانی اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔اصل کام انجام دینے والے دوسرے افراد ہوتے ہیں، مگر پروجیکٹ کے تمام کریڈٹ کا مستحق صرف Investigator ہوتا ہے۔لہٰذا اس طرح کے کاموں کے سلسلہ میں حکیم محمد کبیرالدین کو پروجیکٹ آفیسر سمجھا جانا چاہیے۔

اردو زبان میں طبّی تعلیم کا منصوبہ حکیم اجمل خاں کا تھا۔ مگر اسے عملی شکل وصورت عطا کرنے کا کام حکیم محمد کبیر الدین نے کیا۔ اس زمانہ میں آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج کے نصاب میں جو کتابیں رائج تھیں، ان کی ترتیب وتالیف کا کام حکیم محمد کبیر الدین نے خود انجام دیا تھا یا ان کی نگرانی میں انجام پائے تھے۔ چونکہ یہ کالج اس زمانہ کی طبّی درس گاہوں کے لیے مشعلِ راہ تھا، اس لیے اس عہد کے بیشتر اداروں میں یہ کتابیں رائج رہیں اور آج بھی اساتذہ اور طلبہ ان سے استفادہ کر رہے ہیں۔

یونانی طب میں علمی تحقیق (لٹریری ریسرچ) اور قدیم مباحث کی تنقیح کے لیے حکیم اجمل خاں نے طبیہ کالج سے ملحق ایک ریسرچ کا محکمہ قائم کیا۔ اس کا اہم مقصد یہ تھا کہ طب کے ماہرین، قدیم نصاب پر جدید علوم کی روشنی میں تنقید وتنقیح کریں اور جدید تحقیقات کی روشنی میں طب کا ایک بہتر نصاب تیار کریں۔ اس شعبہ کے کاموں کے لیے حکیم اجمل خاں کی نظر انتخاب جن لوگوں پر پڑی، ان میں حکیم محمد کبیر الدین بھی تھے۔

حکیم اجمل خاں نے اس تحقیقی منصوبہ کے لیے اپنے ساتھیوں کو پابند عہد کرنے کے لیے ایک عہدہ نامہ پر حکیم فضل الرحمان، حکیم عبدالحفیظ، حکیم محمد الیاس خاں، حکیم محمد کبیر الدین اور ڈاکٹر سید ناصر عباس کے دستخط لیے تھے۔ حکیم اجمل خاں نے خود بھی اس پر دستخط کیا تھا۔ یہ واقعہ 2 جولائی 1926ء کا ہے۔

اس شعبہ کے قیام کے کچھ ہی دنوں بعد حکیم اجمل خاں کا انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات کے ساتھ یہ شیرازہ منتشر ہوگیا، لیکن حکیم محمد کبیر الدین نے تنِ تنہا اس منصوبہ کے مطابق کام کو جاری رکھا۔ چونکہ اس کے محرک حکیم اجمل خاں تھے، لہٰذا حکیم محمد کبیر الدین کے تمام کاموں میں اجملی فکر کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔

حکیم محمد کبیر الدین نے یونانی طب کو اردو زبان میں پیش کرنے کے علاوہ، قدیم طبّی مباحث کو جدید اسلوب عطا کرنے کے لیے جدید طب میں رائج مصطلحات کو یونانی بیانوں سے منطبق کیا اور حسب ضرورت جدید طبّی معلومات سے طلبہ کو آشنا کرنے کے لیے طب کی درسیاتی کتب میں اُنہیں شامل کیا۔ یہ کام بڑی جانفشانیوں کا طالب تھا۔ اس کے لیے عربی وفارسی سے واقفیت کے

ساتھ جدید طب اور انگریزی کا شعور، نیز وضعِ اصطلاحات کی صلاحیت درکار تھی۔ حکیم محمد کبیرالدین اس مشکل کام سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

بعض جگہوں پر وضع اصطلاحات اور ان کی تطبیق میں حکیم محمد کبیرالدین سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں، مثلاً سوء القنیہ کو فقرالدم اور Anaemia کہنا ایک صریح غلطی ہے۔ ابتدائی کاموں میں اس طرح کے تسامحات کا قوی امکان ہوتا ہے، لہٰذا ان کوششوں کی توصیف کی جانی چاہئے۔ تاہم اس طرح کے تمام کاموں کا تنقیدی اور تنقیحی جائزہ بھی ضروری ہے تاکہ ان کی اصلاح ہو سکے۔

حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حکیم محمد جمیل خاں سکریٹری منتخب ہوئے۔ ان کے زمانۂ انصرام میں کالج اور اس سے ملحق اداروں میں خاندان کے لوگوں سے اقتدار کی رسہ کشی کے باعث بڑی بدنظمی رہی۔ کالج کے طلبہ نے 1932ء میں اسٹرائک کردی۔ حکیم محمد کبیرالدین، حکیم محمد الیاس خاں اور حکیم فضل الرحمان پر اسٹرائک کی پشت پناہی کا الزام عائد کر کے کالج کی خدمت سے الگ کر دیا گیا۔ حکیم راجندر لال ورما ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مسیح الملک کے انتقال کے بعد طبیہ کالج تباہ ہوگیا، ہندوستانی دواخانہ برباد ہوگیا، محمود خاں کا خاندان خستہ حال ہوگیا۔ جو شریف منزل کسی دور میں دارالامن تصور کی جاتی تھی، یہاں پر بھی طلبِ اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی۔ چنانچہ اس تباہی اور بربادی کے دور میں حکیم محمد کبیرالدین اور ان کے رفقاء جیسے خدمت گزاروں کی خدمت سے طبیہ کالج محروم ہوگیا''۔

حکیم محمد کبیرالدین، حکیم محمد الیاس خاں اور حکیم فضل الرحمٰن کا طبیہ کالج سے اخراج بظاہر ناخوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ ان کے اخراج سے طبیہ کالج کے تعلیمی نظام کو دھچکا بھی لگا۔ لیکن یہ اخراج دوسرے پہلو سے بڑا بابرکت ثابت ہوا اور ان کے اخراج سے طبی درس گاہوں کی فہرست میں ایک عمدہ ادارہ کا اضافہ ہوا۔ طبیہ کالج کی خدمت سے الگ کیے گئے ان تینوں اساتذہ نے 1935ء میں قرولباغ ہی میں 'جامعہ طبیہ' کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی۔ یہی ادارہ آج جامعہ ہمدرد میں اسکول آف یونانی میڈیسن کے نام سے جاری ہے۔

1937ء میں نظام حیدر آباد نے نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ پنجم کے ذریعہ 1891ء میں قائم طبی مدرسہ کو کالج کی شکل عطا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ حکیم مقصود علی خاں اس وقت ناظم سررشتۂ طبابتِ یونانی تھے۔ انہوں نے شفا خانہ اور مدرسہ طبیہ کی تنظیم میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس کو نظامیہ طبیہ کالج تک پہنچانے میں ان کی کوششیں نہایت قابلِ قدر ہیں۔ انہی کی تحریک پر ہندوستان کے مختلف حصوں سے کالج اور صدر شفا خانے کے لیے اطباء بلائے گئے تھے۔

حکیم محمد کبیر الدین اور حکیم فضل الرحمان جامعہ طبیہ دہلی سے نظام کی دعوت پر حیدر آباد چلے گئے۔ حکیم مقصود علی خاں نظامیہ طبیہ کالج کے صدر منتخب ہوئے اور حکیم محمد کبیر الدین کو نائب صدارت تفویض ہوئی اور تعلیم کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں دے دی گئی۔ حکیم محمد کبیر الدین نے کالج کے نظامِ تعلیم کو بہتر بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اجملی فکر کے طرز پر انہوں نے یہاں کے نصاب میں بھی جدید مضامین شامل کر کے طبی نصاب کی اصلاح اور تجدید کی، اِس طرح اجملی تحریک کو شمالی ہند سے جنوبی ہندوستان تک پہنچا دیا۔

حکیم محمد کبیر الدین نے حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں دفتر المسیح کے کاموں کو بھی جاری رکھا۔ اس کا دفتر حیدر آباد کے بازار نور الامراء میں تھا۔

1939ء سے 1947ء تک حکیم محمد کبیر الدین نے نظامیہ طبی کالج میں خدمات انجام دیں۔ یہاں ان کے خلاف سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حالات ناسازگار ہونے کے بعد وہ کالج سے الگ ہو گئے اور تصنیف و تالیف کی طرف توجہ مبذول کی۔ نظام حیدر آباد نے ان کی طبی اور علمی خدمات سے متاثر ہو کر 'شہنشاہِ تصنیفات' کے خطاب سے نوازا تھا اور ان کی کتاب 'کلیاتِ ادویہ' پر توصیفی نوٹ تحریر کیا تھا۔

وہ 1957ء میں چار سال کے ڈیپوٹیشن پر بحیثیت ریڈر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اجمل خاں طبیہ کالج سے وابستہ ہوئے۔ یہاں اُنہیں امورِ طبعیہ کی تدریسی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔ کلیات میں اُنہیں مہارت حاصل تھی۔ اس کے مباحث کی توضیح و تشریح، جدید علوم، خصوصاً منافع الاعضاء کی روشنی میں وہ اس خوبی کے ساتھ کرتے تھے کہ طالب علم کے تمام اشکالات رفع ہو جاتے تھے۔

حکیم محمد مختار اصلاحی لکھتے ہیں:

''امورِ طبعیہ ان کا اصل موضوع تھا۔ انہوں نے یہ موضوع دل کھول کر پڑھایا اور خوب دادِ تحقیق وصول کی، طلبہ اور اساتذہ دونوں کو ان کی یہاں موجودگی سے فیض پہنچا''۔

حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی لکھتے ہیں:

''انہیں طب کے شعبۂ کلیات سے خصوصی دلچسپی تھی، اسے انہوں نے جدید سائنس اور جدید طبی علوم کی روشنی میں جدید تحقیقی انداز میں پیش کیا اور اس مضمون کو منطق و فلسفہ کی گتھیوں سے نکھار کر سلاست و فصاحت کے ساتھ اردو زبان میں عربی اصطلاحات کے ساتھ پیش کیا۔ یہ ان کا بڑا قابلِ قدر کارنامہ ہے''۔

حکیم محمد کبیر الدین تصنیف و تالیف کے آدمی تھے، مگر وہ طبی تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ 1939ء سے 1955ء کے درمیان کئی مرتبہ اُنہوں نے آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی تقریبوں کی صدارت کی اور طبی کاز کے لیے آواز بلند کی، لیکن ان کا اصل میدان درس و تدریس اور تصنیف و تالیف تھا۔ وہ مطب وغیرہ سے دور رہے۔ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کے میدان میں ان کی صلاحیت کا اصل جوہر وہاں نظر آتا ہے، جہاں انگریزی اصطلاحات کے مقابل اُنہوں نے آسان اور برمحل طبی اصطلاحات قائم کی ہیں۔ وضعِ اصطلاحات کے سلسلہ میں اُنہیں واقعی ملکہ حاصل تھا۔ حکیم عبدالحمید بانیٔ جامعہ ہمدرد لکھتے ہیں:

''موجودہ صدی میں طب یونانی میں تصنیف و تالیف کی جو خدمت حکیم کبیر الدین نے انجام دی، اس کی مثال شاذ و نادر ملتی ہے۔ ان کی علمی خدمات کا دائرہ نصف صدی سے زیادہ پر محیط ہے۔ انہوں نے طبی تراجم بھی کیے اور مختلف طبی موضوعات پر تصنیف و تالیف کے اعلیٰ کارنامے بھی انجام دیے۔ وضعِ اصطلاحات اور نصابی کتب کی ترتیب و تالیف، نیز اشاعت کے میدان میں انہوں نے نمایاں کام کیا ہے''۔

حکیم اجمل خاں نے یونانی نصاب کے اصلاح کی جو تحریک شروع کی تھی، اسے عملی

شکل عطا کرنے کا کام دراصل حکیم محمد کبیرالدین نے کیا اور زندگی بھر اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے قلمی جہاد کرتے رہے۔

حکیم محمد کبیرالدین کے علمی کاموں کا اصل زمانہ 1947ء تک ہے۔ تقسیم کے بعد ان کا قلم سست گام نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ تقسیم کے ہنگاموں میں ادارۂ المسیح کو فسادیوں نے بڑا نقصان پہنچایا۔ اس ہنگامے میں بڑی تعداد میں ان کے مسودے ضائع ہوئے۔ سست گامی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تقسیم کے بعد ادارہ المسیح کا عملہ بکھر گیا اور ان کے علمی معاونین اب ساتھ نہیں رہے۔ تقسیم کے بعد معاشی اور صحتی مسائل بھی علمی کاموں کی راہ میں حائل ہوئے، بہر کیف حکیم محمد کبیرالدین نے طبی دنیا کو اتنا کچھ دیا ہے کہ طبی برادری ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی۔

عمر کے آخری ایام میں عرق النساء اور دمہ میں مبتلا رہے۔ 82 برس کی عمر میں 9 جنوری 1976ء بروز جمعہ دہلی میں وفات پائی اور یہیں مدفون ہوئے۔

درج ذیل کتابیں حکیم کبیرالدین کی یادگار ہیں۔ اس فہرست میں شامل کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں، جن کی تالیف ان کی نگرانی میں ادارہ المسیح کے اراکین نے انجام دی ہیں اور انہوں نے ان کی تصحیح اور تہذیب و تنقیح کی ہے۔

فہرست کتب

نمبر شمار	نام کتاب
1	اصولِ حمیات
2	رسالۂ سل ودق
3	رسالۂ سوزاک
4	رسالۂ ذیابیطس
5	رسالۂ دیدان امعاء
6	رسالۂ غاشیہ غامیہ
7	رسالۂ موتی جرہ وحمی ہذیانیہ
8	رسالۂ آتشک

9 رسالۂ ہیضہ

10 رسالۂ بواسیر

11 رسالۂ جدری

12 رسالۂ طاعون

13 حمیاتِ اجامیہ

14 آسان نسخے (مجرب چٹکلے)

15 ترجمۂ کبیر۔ شرح اسباب کا ترجمہ، حصۂ اول

16 ترجمۂ کبیر۔ شرح اسباب کا ترجمہ، حصۂ دوم

17 ترجمۂ کبیر۔ شرح اسباب کا ترجمہ، حصۂ سوم

18 ترجمۂ کبیر۔ شرح اسباب کا ترجمہ، حصۂ چہارم

19 حمیاتِ قانون، حصۂ اول

20 حمیاتِ قانون، حصۂ دوم

21 میزان الطب، اردو ترجمہ مع فرہنگ

22 تدابیرِ دق

23 رسالۂ ناصور و باسور

24 رسالۂ وبال ونکال

25 زادِ غریب مخزن التعلیم کا اردو ترجمہ

26 ترجمہ وشرح کلیاتِ نفیسی، حصۂ اول

27 ترجمہ وشرح کلیاتِ نفیسی، حصۂ دوم

28 ترجمۂ نفیسی، علم الادویہ، حصۂ اول

29 افادۂ کبیر (قانون شیخ کا خلاصہ موجز القانون کا ترجمہ)

30 ترجمۂ نفیسی، علم الادویہ، حصۂ دوم

31 افادۂ کبیر مجمل (شرح موجز)

32 افادۂ کبیر مفصل

33 موجز القانون (عربی و اردو ترجمہ)

34 ترجمہ و شرح کلیاتِ قانون، حصہ اول

35 ترجمہ و شرح کلیاتِ قانون، حصہ دوم

36 کلیات کے مباحث ضروری

37 کتاب الاخلاط

38 رسالۂ قارورہ (طب قدیم سے)

39 طبِ یونانی کی پہلی کتاب

40 برہانِ براہینِ قاطعہ

41 رسالۂ مسماع الصدر

42 رسالۂ مقیاس الحرارت

43 طب قدیم و جدید کی معرکۃ الآراء علمی جنگ

44 کتاب التشخیص، حصہ دوم

45 رسالۂ جراثیم و طبِ قدیم

46 رسالۂ جراثیم اور طبیعت

47 کتاب الادویہ تکملہ، حصہ اول

48 کتاب الادویہ، حصہ دوم (مخزن المفردات)

49 بیاضِ کبیر، حصہ اول

50 بیاضِ کبیر، حصہ دوم

51 بیاضِ کبیر، حصہ سوم

52 رسالۂ مدار بوٹی

53 ارمغان

54 منافعِ کبیر

55 رسالۂ نبض

56 دورانِ خون اور طبِ قدیم

57 علاج الامراض، حصۂ اول

58 علاج الامراض، حصۂ دوم

59 مجموعۂ کبیر مسمٰی بہ قانونِ نسل

60 تشریحی تصاویر

61 تشریحِ صغیر، حصۂ اول

62 تشریحِ صغیر، حصۂ دوم

63 تشریحِ صغیر، حصۂ سوم

64 تشریحِ کبیر، حصۂ اول

65 تشریحِ کبیر، حصۂ دوم

66 رسالۂ اسمائے امراض، اول

67 رسالۂ اسمائے امراض، دوم

68 رسالۂ بحران

69 رسالۂ اخلاط

70 رسالہ سم الفار

71 رسالۂ کچلہ

72 الاکسیر

73 معالجات امراضِ نسواں

74 القابلہ

75 صدری مجربات

76 القرابادین

77 ترجمۂ علاج الامراض

78 علم الجراحت

79 امراضِ صبیان

80 عمل احتقان (انجکشن کے طریقے)

81 کتاب التکلیس

82 فرہنگ طبی

83 لغاتِ کبیر، حصہ اول

84 لغاتِ کبیر، حصہ دوم

85 تشریحی اصطلاحات

86 طبی لغاتچہ

87 رسالہ اوازنِ طبی مع فہرست دار الکتب المسیح

مطالعاتی مآخذ

1۔ حکیم محمد کبیر الدین ۔ حیات اور کارنامے، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، دہلی، 1995ء

2۔ تذکرہ اطباءِ عہد عثمانی، حکیم شفا حیدر آبادی، صحیفہ پریس، حیدر آباد، 1952ء

3۔ تاریخ اطباءِ بہار، حکیم محمد اسرار الحق، لیتھو پریس، پٹنہ، 1980ء

4۔ ہندوستان کے مشہور اطباء، حکیم حافظ سید حبیب الرحمان، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 2000ء

5۔ دلی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمان، اردو کادمی، دہلی، اشاعتِ ثانی 2011ء

6۔ ہسٹری آف یونانی میڈیسن اِن حیدر آباد، حکیم ابوالحسن اشرف، شائع کردہ ڈاکٹر احمد اشرف میموریل لائبریری فار میڈیکل اینڈ کانٹمپوریری سائنسز، حیدر آباد، 2010ء

شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں

شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں پٹیالہ کے مشہور قصبہ سنام میں پیدا ہوئے، مروّجہ تعلیم کے ساتھ اپنے والد حکیم محمد علی خاں سے طب کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں۔ حافظہ نہایت عمدہ تھا، محض چودہ برس کی عمر میں 'رباعیاتِ طبِ یوسفی' حفظ کر لیا تھا۔ ابھی چودہ برس کی عمر کو پہنچے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ طب کی انتہائی کتب اپنے تایا حکیم مہر علی خاں شاہی طبیب سے پڑھیں اور اُنہیں سے مطب و معالجہ کی تعلیم حاصل کی۔

1914ء میں پٹیالہ میں مطب شروع کیا، فنی قابلیت اور ذہانت کی بدولت علاج و معالجہ میں بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ 1917ء میں ہز ہائینس کردن پرنس مہاراجہ ادھیراج والیٔ بڑودہ کے علاج کے لیے مدعو کیے گئے۔ دوسرے کئی امراض کے ساتھ مہاراجہ کے معدہ اور جگر میں صلابت بھی تھی۔ حکیم دلبر حسن خاں کو کامیاب اور شاندار معالجہ پر معقول فیس کے ساتھ ایک خطیر رقم بطور انعام پیش کی گئی۔

امراء اور والیانِ ریاست کے علاوہ بہت سے یوروپین آفیسر بھی شفاء الملک کے زیرِ علاج رہے ہیں۔ یہ اعزاز بہت کم ہندوستانی طبیبوں کے حصہ میں آیا ہے۔ انگلستان کے معروف پروفیسر ڈاکٹر ایل ایف شبروک ویلس، محکمۂ انفارمیشن بیورو، گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈائرکٹر تھے۔ اُنہیں شفاء الملک سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔

13 جنوری 1927ء کو بھوپندر طبیہ کالج میں تقسیمِ اسناد کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ اس تقریب میں اطراف واکناف کے جلیل القدر اطباء نے شرکت کی تھی، ڈاکٹر شبروک ویلس نے اس کی صدارت فرمائی تھی۔ اُنہوں نے انگلستان کے مشہور اخباروں میں یونانی طب کی عظمت کا

اعتراف کرتے ہوئے شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں کے متعلق لکھا تھا کہ ہندوستان میں حکیم دلبر حسن خاں صاحب جس معجزانہ طبّی حذاقت کے حامل ہیں، انہیں دیکھ کر یونانی طب کی رفعت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ شبروک ولیمس کا یہ مضمون ہندوستان کے کئی انگریزی اور اردو اخباروں نے بھی شائع کیا تھا۔

شفاء الملک نے 1930ء میں پٹیالہ میں ایک یونانی شفاخانہ جاری فرمایا، جس میں پٹیالہ کے علاوہ ملک کے دوسرے علاقوں سے بھی مریض آتے تھے اور شفا حاصل کرتے تھے۔ مہاراجہ بھوپندر نے اس شفاخانہ کو میونسپلٹی سے ایک ہزار روپیہ سالانہ دیے جانے کا حکم فرمایا تھا، مگر یہ امداد صرف دو سال ملی۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے حکیم دلبر حسن خاں کی طبّی قابلیت اور فنی حذاقت کے اعتراف میں 'شفاء الملک' کے خطاب سے نوازا تھا، وہ اس خطاب سے مفتخر ہونے والے پنجاب کے پہلے طبیب ہیں۔ حکیم دلبر حسن خاں، حاذق اور ماہر طبیب کے علاوہ ایک اچھے صاحبِ قلم بھی تھے۔ طب المجربات، گنجینۂ مجربات اور طبّی فارماکوپیا وغیرہ ان کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

غیر منقسم پنجاب کا شمار اہم طبّی مراکز میں رہا ہے۔ طبّی صحافت، تحریک اور تعلیم کے حوالہ سے یہاں جو کام انجام پائے ہیں، ان سے یونانی طب کے تحفظ اور فروغ میں بہت مدد ملی ہے۔ یہاں پر طبّی صحافت، تحریک اور تعلیم کے فروغ میں حکیم دلبر حسن خاں کی خدمات نہایت بیش قدر ہیں۔

بھوپندر طبّیہ کالج کا قیام شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں کا بہت اہم کارنامہ ہے۔ اس کو صوبۂ پنجاب کی پہلی باقاعدہ طبّی درس گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے صوبۂ پنجاب اور اس کے اطراف میں طبّی تعلیم کی اشاعت ہوئی۔ 1925ء میں اس کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ابتداء میں اس کا نام 'دار العلوم طبّیہ' تھا۔ حکیم دلبر حسن خاں نے ریاست کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مہاراجہ پٹیالہ، بھوپندر کے نام اسے موسوم کرنے کی اجازت چاہی۔ 25 مئی 1927ء کو مہاراجہ کی طرف سے انہیں یہ اجازت مرحمت ہوئی اور ان کے نام سے یہ کالج موسوم ہوا۔

ریاست پٹیالہ نے اس کالج کی سرپرستی قبول کی اور ریاست کی طرف سے اٹھارہ سو روپے سالانہ بطور امداد مقرر ہوئے۔ اس کالج میں تعلیمی فیس بہت معمولی رکھی گئی تھی۔ سالِ اول کے طلبہ

کے لیے دو روپے بارہ آنے اور دوسرے و تیسرے سال کے طلبہ کے لیے تین روپے بارہ آنے ماہوار مقرر تھے۔

اس کالج میں داخلہ کی اہلیت انٹرنس یا منشی، مولوی اور ادیب تھی، مدتِ تعلیم تین سال تھی اور فارغین کو 'حاذق الحکماء' کی سند دی جاتی تھی۔ یہاں کے اساتذہ میں حکیم اور ڈاکٹر دونوں تھے۔ طب کے ساتھ ڈاکٹری کے ضروری مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔

کالج کا اپنا خیراتی شفاخانہ تھا، جہاں اساتذہ کے زیرِ نگرانی طلبہ تشخیص و تجویز سیکھتے تھے، کالج میں صیدلاتی مشق و مزاولت کا بھی اہتمام تھا۔ شفاخانہ میں مریضوں کے استعمال ہونے والی دوائیں طلبہ کے ذریعہ تیار کروائی جاتی تھیں۔

جدید طب کی واقفیت کے لیے ریاست کے سب سے بڑے سرکاری شفاخانہ راجندر ہسپتال میں ڈاکٹروں کی نگرانی میں عملی مشق سیکھنے کا انتظام تھا۔

بھوپندر طبیہ کالج ایک اقامتی ادارہ تھا، یہاں ہندو، مسلم اور سکھ، تینوں مذاہب کے طلبہ کی رہائش کا انتظام تھا، مگر ہر ایک کے کھانے کا علاحدہ بندوبست تھا۔ کالج کا استاذ، دارالاقامہ کے نظم و نسق کا انچارج ہوتا اور طلبہ میں سے ہاؤس مانیٹر اور فوڈ مانیٹر ہوتے تھے۔ ماہ نامہ 'الشفاء' میں شائع ایک اعلانیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1945ء میں پروفیسر مولوی محمد سلیم الدین ڈی آئی ایم ایس علیگ بورڈنگ ہاؤس انچارج اور سدرشن لال آہوجہ طالب علم سال سوم، فوڈ مانیٹر مقرر ہوئے تھے۔ مارچ 1945ء کے لیے طالب علم نندن لال آدتیہ کو فوڈ مانیٹر بنایا گیا تھا۔

1927ء میں کالج کے حسنِ انتظام اور اعلیٰ معیارِ تعلیم سے خوش ہو کر پنجاب گورنمنٹ نے یہاں کے سند یافتگان کو میونسپل کمیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور چھوٹے قصبات کی کمیٹیوں میں بطور طبیب ملازم رکھے جانے کے حقوق عطا فرمائے تھے۔ گورنمنٹ یوپی اور گورنمنٹ سی و برار نے اس کالج کی سند کو تسلیم کرتے ہوئے، یہاں کے طلبہ کو خاص مراعات عطا فرمائیں۔ اُترپردیش انڈین میڈیسن بورڈ نے اس کالج کے سند یافتگان کے رجسٹریشن کی منظوری دی تھی۔ ریاستِ بھوپال نے بھی اس کالج کو تسلیم کیا تھا۔

شفاء الملک حکیم دلبر حسن خاں کالج کے بانی اور مہتمم تھے، کسی عوامی تعاون کے بغیر

صرف طلبہ کی فیس اور ریاستِ پٹیالہ کی مالی امداد سے اس کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ مگر کالج کا دائرہ وسیع ہوا تو ریاست کی طرف سے ملنے والی رقم اس کے مصارف کی تکمیل کے لیے ناکافی ہوگئی۔ شفاء الملک نے کالج کو جاری رکھنے کے لیے تقریباً چالیس ہزار روپے اپنی جیبِ خاص سے صرف کردیے، پھر بھی یہ کالج تقریباً دس ہزار روپے کا مقروض تھا۔ لہٰذا بادلِ ناخواستہ اس کو جاری رکھنے کے لیے عوام سے تعاون کی اپیل کی گئی، حالانکہ پہلے جلسۂ تقسیمِ اسناد کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریب میں شریک طب کے کئی بہی خواہوں نے مالی تعاون کی پیش کش کی تھی، مگر شفاء الملک نے اس وقت کسی تعاون سے منع کردیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے یہ اثرات تھے کہ میٹرک پاس طلبہ کو بھی اس زمانہ میں اچھی ملازمتیں مل جاتی تھیں، اس لیے عام کالجوں میں طلبہ کے داخلہ کا تناسب کم ہوگیا تھا۔ طبی کالجوں میں یہ تناسب اور بھی کم تھا، چنانچہ بھوپندر طبیہ کالج، پٹیالہ میں ڈیڑھ سو طلبہ سے تعداد کم ہوتے ہوتے صرف 31 یا 32 رہ گئی تھی اور اخراجات دوچند تھے، لہٰذا کالج کو جاری رکھنے کے سلسلہ میں مالی وسائل بڑھانے کی ضرورت تھی۔ حکیم امان اللہ خاں رئیس اعظم ملتان نے، جو کالج کے بہی خواہوں میں تھے، عوام سے تعاون کی اپیل کی اور ایک اسکیم یہ رکھی کہ کالج کی مجلس مشاورت میں ایک فیصد ممبران کا اضافہ کیا جائے اور ہر اُس بہی خواہ کو اِس کا ممبر بنایا جائے جو کم از کم سو روپیہ کی امداد کرے۔

ہندوستان کی ہر ریاست میں یہاں کے فارغین کو پریکٹس کا حق حاصل تھا۔ 'الشفا' میں شائع ایک اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے ایک سند یافتہ حاذق الملک ڈاکٹر مرزا مختار عالم گورکانی دہلوی نے یہاں سے فراغت کے بعد لیبورٹری ٹریننگ حاصل کی اور ارون اسپتال میں ایک سال کام کرنے کے بعد امریکن فوجی اسپتال میں طبی خدمات کے لیے 175 روپے ماہوار پر مامور ہوئے۔

1945ء کے اشتہارِ داخلہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کالج میں پرائیویٹ تعلیم کا بھی نظم تھا۔ حکیم محمد اصغر شہید شروانی اس وقت کالج کے پرنسپل تھے۔

'الشفا' کے نام سے اس کالج کا ایک ماہانہ ترجمان تھا۔ اس کے مدیر حکیم محمد اسلم

جالوی بہاری تھے۔ یہ رسالہ ابتداء میں پٹیالہ سے شائع ہو رہا تھا، بعد میں اس کا مرکزی دفتر دہلی منتقل ہو گیا تھا۔ اس کے سرپرست حکیم دلبر حسن خاں تھے۔ اس رسالہ کی شرح چندہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کالج کے ترجمان کے علاوہ، اس کے مالی تعاون کا ایک وسیلہ بھی تھا۔ عام لوگوں کے لیے سالانہ چندہ ڈیڑھ روپے جب کہ روٴساء کے لیے پانچ روپے اور والیان ریاست کے لیے یہ شرح پچیس روپے تھی۔

حوالہ جاتی مآخذ

1۔ رموزِ حکمت، حکیم محمد عبدالرحیم جمیلؔ، اقبال اسٹیم پریس، گجرات، غیر مورخ

2۔ ماہ نامہ الشفاء، پٹیالہ، جلد 2، شمارہ 8، جولائی 1928ء

3۔ ماہ نامہ الشفاء، دہلی، جلد 17، شمارہ 2-1، جنوری۔فروری 1945ء

شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی

شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی 1896ء میں گجرات میں پیدا ہوئے۔ اُن کے بزرگوں کا تعلق کشمیر سے تھا۔ قرشی کے والد قاضی فضل الدین ممتاز عالم، اچھے شاعر اور نثر نگار تھے، اُنہیں مفتی صدرالدین آزردہ سے تلمذ حاصل تھا۔

قرشی نے ابتدائی تعلیم گجرات میں حاصل کی اور درسیات کی تکمیل اسلامیہ کالج لاہور سے کی۔ 1912ء میں اسلامیہ کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں تُرک مسلمانوں کے لیے چندہ جمع کرنے کے جرم میں انگریز پرنسپل نے اُنہیں کالج سے نکال دیا۔ یہاں سے اخراج کے بعد طبی تعلیم کے لیے وہ دلّی آئے اور مدرسہ طبیہ، دہلی سے سند فراغت حاصل کی۔ یہاں انہیں مسیح الملک سے استفادہ کا موقع ملا۔ اُن کی ذہنی و فکری تربیت مسیح الملک ہی کی مرہونِ منت ہے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں، قرشی کی صلاحیتوں کے مداح اور معترف تھے۔ جب قرشی مدرسہ طبیہ میں داخل ہوئے تو وہ صرف محمد حسن تھے۔ حکیم اجمل خاں نے اُنہیں قرشی کا لقب دیا، اِس طرح یہ لقب محمد حسن کے نام کا جزء بن گیا اور وہ تاریخ میں شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی کے نام سے مشہور ہوئے۔ حکیم اجمل خاں نے محمد حسن کے اندر علامہ علاء الدین قرشی کی شخصیت کا جو عکس دیکھا تھا، وہ سچ ثابت ہوا۔

مدرسہ طبیہ، دہلی سے فراغت کے بعد قرشی نے کچھ دنوں اس میں تدریسی فرائض انجام دیے، پھر ممبئی چلے گئے اور وہاں مطب کا آغاز کیا۔ 1920ء میں ممبئی کو خیر باد کہہ کر لاہور میں قیام پزیر ہو گئے اور وہاں مطب و معالجہ، طبی صحافت، طبی تحریک اور تصنیف و تالیف کے میدان میں تا دمِ آخر سرگرم رہے۔

شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی کا شمار بیسویں صدی کے اہم ترین طبیبوں میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم بعد جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو وہاں یونانی طب کے احیاء اور فروغ میں جن طبیبوں نے کردار ادا کیا، ان میں قرشی کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ لاہور منتقل ہونے کے بعد انہوں نے پنجاب طبّی کانفرنس کی بنیاد ڈالی اور اس کے صدر مقرر ہوئے۔

1936ء میں حکومتِ حیدر آباد کی قائم کردہ طبّی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے، 1946ء میں حکومتِ ہند کی جانب سے مقرر کردہ طبّی کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔ حکومتِ پنجاب نے انہیں طبّی بورڈ کا رکن بنایا، وہ طبّیہ کالج دہلی کے ٹرسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مجلسِ منتظمہ کے رکن رہے ہیں۔ 1958ء اور 1968ء میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے قائم کردہ طبّی بورڈوں کے صدر مقرر ہوئے۔ حکومتِ پاکستان کی سائنسی اور صنعتی کونسل کی جانب سے مقرر کردہ کمیٹی کے رکن بھی رہے ہیں۔

لاہور میں اقامت پزیر ہونے کے بعد اسلامیہ کالج میں طبّیہ کلاسز کو پڑھانا شروع کیا۔ حکیم مفتی سلیم اللہ کے انتقال کے بعد طبّیہ کلاسز کے ہیڈ لکچرر مقرر ہوئے۔ قرشی کی کوششوں سے طبّیہ کلاسز کو طبّیہ کالج کا درجہ ملا اور ہیڈ لکچرر کی جگہ پرنسپل کا عہدہ مقرر ہوا۔ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی اس کالج کے پہلے پرنسپل منتخب ہوئے۔

یونانی طب کی نشر و اشاعت اور طبیبوں کو بیدار کر کے طبّی کاز کی خاطر متحد کرنے کے لیے 1922ء میں 'مشیر الاطباء' کے نام سے ایک ماہانہ طبّی رسالہ جاری کیا، قرشی اس رسالہ کے مدیر تھے۔ یہ رسالہ 'اخوان الصفا' نامی ایک مجلس کے زیر انتظام شائع ہوتا تھا۔ اس میں طبیبوں اور ڈاکٹروں کے مضامین کے علاوہ طبّی انجمنوں اور طبّی اداروں کی رپورٹیں شائع ہوتی تھیں۔ آج بھی ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں اس کے شمارے موجود ہیں۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں نومبر 1923ء سے جون 1963ء تک کے شمارے محفوظ ہیں۔ 'مشیر الاطباء' نے سالہا سال طبیبوں کی تنظیم اور حکومت سے ان کے مطالبات تسلیم کرانے کی راہیں ہموار کیں۔

تقسیم سے پہلے قرشی آل انڈیا آیورویدک اینڈ طبّی کانفرنس کے سرگرم رکن تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد آل انڈیا آیورویدک اینڈ طبّی کانفرنس کی جانشین جماعت، آل پاکستان آیورویدک اینڈ

طبی کانفرنس کا اجراء کیا اور اس میں مغربی و مشرقی پاکستان کے اطباء اور ویدوں کو شامل کرنے کے لیے تگ و دو شروع کی اور پاکستان کے مختلف مقامات پر اس کے بڑے شاندار پروگرام منعقد کیے۔ کانفرنس کی جدوجہد سے پاکستان میں رجسٹریشن ایکٹ نافذ ہوا اور حکومت نے طبی بورڈ مقرر کیا، قرشیؒ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

اطباء کی مختلف الخیال جماعتوں کو متحد کرنے کے لیے قرشیؒ مستقل کوشاں رہے۔ ان کی کوششوں سے پروفیسر حکیم سید علی احمد اور حکیم نیر واسطی کی جماعتوں، مجلس اتحاد الاطباء اور جمعیت انصار، طبی کانفرنس میں مدغم ہوئیں اور طبی کانفرنس سارے پاکستانی طبیبوں کی متحدہ تنظیم بنی۔

قرشیؒ نے پاکستانی طبیبوں میں باہمی مشاورت کے فروغ اور ادویاتی تحقیق کے لیے ادارہ تحقیقاتِ طبیہ قائم کیا۔ یہ ادارہ ادویاتی تحقیق کے سلسلہ میں بڑی اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال سے قرشیؒ کے بہت گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ قرشیؒ علامہ اقبال کے معالج بھی تھے اور علامہ کے ساتھ ان کا دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے متحدہ ہندوستان میں محمد علی جناح (قائداعظم) نے طبیہ کالج قرولباغ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان میں دیسی طبوں کا فروغ ہوگا، مگر پاکستان بننے کے بعد وہاں افسر شاہی کا تسلط ہوگیا۔ یہ افسران مغرب کے پرستار اور مشرقی علوم وفنون کے دشمن تھے۔ چنانچہ جس پاکستان میں جناح نے یونانی طب کے فروغ کا وعدہ کیا تھا، اسی میں یونانی طب کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا۔

تقسیم کے بعد مرکزی طبی کانفرنس ہندوستان میں رہ گئی تھی۔ طبی خاندانوں کی مرکزیت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ہزاروں اطباء پاکستان کے قصبات و دیہات کی خاک چھان رہے تھے۔ محکمۂ صحت پر ایلوپیتھی ڈاکٹروں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے یونانی طب کے خلاف مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ پاکستان میں دیسی طبوں پر پابندی لگائی جائے۔ اس وقت پاکستان میں یونانی طب اُسی دور سے گزر رہی تھی جس سے 1910ء کے بعد اسے متحدہ ہندوستان میں گزرنا پڑا تھا۔ ان مشکل حالات میں شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشیؒ اور ان کے رفقاء اسی طرح میدان میں اُترے، جس طرح مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور ان کے رفقاء 1910ء

میں میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ کے خلاف میدان میں اُترے تھے۔

دیگر شعبوں کی طرح تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی قرشی نے اہم سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔ اُن کی کچھ اہم تصانیف درج ذیل ہیں۔

1۔ جامع الحکمت:

یہ قرشی کی مہتم بالشان تالیف ہے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں تقریباً دو ہزار صفحات پر محیط ہے۔ یہ مقدمہ یا دیباچہ کے بجائے تاریخ طب سے شروع ہوتی ہے۔ اِس مقالہ میں قرشی نے طب کے مختلف تاریخی ادوار بیان کرنے کے ساتھ یونانی اور مغربی طب کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔

جامع الحکمت کے پہلے باب میں علمِ طب کی تعریف اور اُمور طبعیہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے باب میں جسمِ انسانی کی مکمل ساخت کا تذکرہ ہے۔ تیسرا باب قانونِ صحت کے زیرِ عنوانِ حفظانِ صحت کے اصولوں پر مشتمل ہے۔ چوتھا باب علم الامراض اور پانچواں باب تشخیصِ امراض کے بارے میں تفصیلی اور مربوط مضمون پر مشتمل ہے۔ چھٹے باب میں علاج الامراض کے تحت ان اصول وقواعد کا ذکر کیا گیا ہے، جن کو علاج و معالجہ کے سلسلہ میں ملحوظِ خاطر رکھنا ہر طبیب کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

اس کتاب میں قدیم طب کی بہترین معلومات کو ترتیب دینے کے ساتھ طبِ جدید کے ضروری اضافات بھی شامل کیے ہیں۔ اصولِ علاج میں یونانی طب کو فوقیت دی ہے۔ البتہ کہیں کہیں طب جدید کی معترفانہ توضیح بھی کی ہے۔

یہ کتاب تاریخ، اُمور طبعیہ، علم الامراض اور معالجات کا ایک عمدہ مجموعہ ہے۔

2۔ بیاضِ خاص:

یہ افسر الاطباء حکیم نورالدین بھیروی کے اکسیری مجربات کا مجموعہ ہے، جسے حکیم محمد حسن قرشی نے حکیم ریاض احمد قرشی کے تعاون سے مرتب کیا ہے۔ زیر نظر بیاض شیخ محمد بشیر اینڈ سنز لاہور کی شائع کردہ ہے۔ سنہ اشاعت مذکور نہیں ہے۔

3- طبِ قدیم اور حکومتِ پنجاب:

اس کتاب میں قرشی نے تاریخی حوالوں اور ضروری اعداد و شمار کے ذریعہ حکومتِ پنجاب کے اُس اعتراض کا جواب دیا ہے، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ یونانی طب نامکمل اور غیر سائنسی ہے۔

4- طبّی فارما کوپیا (جلد اوّل تا سوم)

ان میں یونانی، انگریزی اور پیٹنٹ ادویہ کی تفصیلات درج ہیں۔

5- سلکِ مروارید:

مردانہ ضعف اور نامردی سے متعلق نہایت جامع تالیف ہے۔ اس میں ضعف باہ کی ماہیت، اسباب و علامات اور علاج بیان کیے ہیں۔ علاج کے ذیل میں یونانی، آیورویدک اور ایلوپیتھی کی مجرب دوائیں لکھی ہیں۔

6- قانونِ ازدواج:

اس میں ازدواجی زندگی کے مسائل مثلاً صحبت کے قوانین، طریقے، اوقات، ہدایات، قوتِ مخصوصہ بڑھانے کی تدابیر اور تلذذ وغیرہ کی صورتیں بتلائی گئی ہیں۔

7- بیاضِ مسیحا:

اس میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور ان کے خاندان کے مجربات و معمولات کے نسخے درج ہیں۔

8- کتاب العلاج:

یہ کتاب طبِ جدید اور قدیم کی بہترین کتابوں کا خلاصہ ہے۔ ابتداء میں تاریخِ طب، تشریح، حفظانِ صحت، اصولِ علاج، ماہیت، اسباب، علامات، تشخیص، فروق الامراض اور انجام و عوارض کو نظام وار اور سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔ علاج میں عام ہدایات، اصولِ علاج اور بہترین نسخوں کے علاوہ اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ مرض کی مختلف صورتوں اور مختلف اوقات سے متعلق نسخے آجائیں۔

9- جداولِ جالینوس: جالینوس کی بیاض کا ترجمہ ہے۔

10۔ مختصر الکلیات:

اصول وکلیات کی مختصر مگر مفید کتاب ہے۔اس میں رموز تشخیص، نبض، قارورہ، اصول علاج، اسبابِ مرض اور حفظان صحت وغیرہ سے متعلق اُمور، سادہ زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب قانون شیخ کا خلاصہ ہے۔اس کے آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے۔

11۔ تذکرہ مسیح الملک:

مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے سوانحی حالات پر مشتمل ایک اہم دستاویز ہے۔اس کا شمار حکیم اجمل خاں کے اہم سوانحی مآخذ میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب دراصل مشیر الاطباء کا

ماہ نومبر ودسمبر

کا خصوصی شمارہ ہے، جسے قرشی نے تالیف کیا ہے۔

مطالعاتی مآخذ

1۔ ماہنامہ رہنمائے صحت (فیصل آباد، پاکستان) شفاء الملک نمبر، جلد28،شمارہ3-2، اکتوبر۔نومبر 1984ء

2۔ جامع الحکمت (جلد اوّل)، شفاء الملک محمد حسن قرشی، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، اردو بازار، لاہور، غیر مورخ

3۔ بیاضِ خاص، شفاء الملک محمد حسن قرشی، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، اردو بازار، لاہور، غیر مورخ

4۔ ہندوستان میں اردو طبی صحافت ۔آغاز وارتقاء، اسعد فیصل فاروقی، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ، 2011ء

5۔ مشیر الاطباء، لاہور (ماہنامہ) جلد 3، شمارہ 6، مارچ 1925ء

6۔ تذکرہ مسیح الملک، محمد حسن قرشی، کریمی پریس، لاہور، غیر مورخ

Unani Tib ka Mughal aur Bartanvi Ahd

(16th-19th AD)

Hakim Fakhre Alam

ISBN: 978-81-940846-1-7

2019,600 Copies

Price:Rs. 500

Printed by AR Enterprises , New Delhi

Published by : *Hakim Fakhre Alam*

Distributer : Maktaba Jamia LTd.

Shamshad Markit,Aligarh ,202002

Correspondence:

Hakim Fakhre Alam

D-2nd Floor,Samreen Apartment

Shah Basheer Colony, Hadi Nagar

Dhaurra Mafi , Aligarh-202002

Mobile No.:9411653041

Email: fakhrealamx7598@gmail.com

Unani Tib
ka
Mughal aur Bartanvi Ahd

(16th - 19th AD)

Hakim Fakhre Alam

AR Enterprises,New Delhi
2019

Unani Tib ka
Mughal aur Bartanvi Ahd
by
Hakim Fakhre Alam

قلمی نقوش

عکسِ خامہ
حکیم سید ظل الرحمان۔ ایک مطالعہ
رازیٔ ہند۔ پروفیسر حکیم محمد طیب
نشانِ اجمل
ہندوستان کی طبی درس گاہیں
اردو طبی مترجمین
یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد
طبی اخلاقیات

ترتیب وتدوین میں اشتراک

نقوشِ اجمل
اسٹینڈرڈ یونانی ٹریٹمنٹ گائڈ لائن۔ جلد اول
اسٹینڈرڈ یونانی ٹریٹمنٹ گائڈ لائن۔ جلد دوم

حکیم فخر عالم

₹- 500/- 2019
ISBN: 978-81-940846-1-7
9 78 8194084617
A.R. ENTERPRISES
E-198 Jaitpur Extn., New Delhi-44
E: burnaigraphic@gmail.com